دینی امور و مسائل سے واقفیت کے لیے کارآمد اور مفید ہے۔

اقبال اور مُلّا ۔ مولفہ جناب منشی عبدالرحمن صاحب، تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحات،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ: گوشۂ ادب، چوک انار کلی، لاہور،

مذہبی پابندیوں سے آزادی کی وبا پاکستان میں برابر پھیلتی جاتی ہے، اور اس نے ایک مستقل تحریک کی شکل اختیار کرلی ہے، جس کے رہنما منکرین حدیث اور ان کے استاد اول مغرب زدہ طبقہ ہے، اور اس کے لیے "ملاازم" کی اصطلاح گڑھی گئی ہے، اور ایک مستقل "اینٹی ملافرنٹ" قائم ہوگیا ہے جس کا مقصد علمائے کرام کی تحقیر و تفضیح اور مذہب کی غلط تعبیر ہے، اور یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ اس میں بعض ایسی ہستیاں بھی شامل ہیں جو کلام اقبال کی بہترین شارح سمجھی جاتی ہیں، چنانچہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے "اقبال اور ملا" کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے، جو ہماری نظر سے نہیں گذرا، لیکن "اقبال اور ملا" میں اس کے جو اقتباسات نقل کیے گئے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں ملا کے بارہ میں اقبال کے طنزیہ اشعار نقل کیے گئے ہیں، اور اس کے حاشیہ میں علمائے کرام کو ہر قسم کے الزاموں اور طعن و طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے، اور یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے سخیف خیالات ڈاکٹر صاحب کے جیسے سنجیدہ شخص کے قلم سے نکل سکتے ہیں، مگر تجدد کا ذوق جو بھی کرائے کم ہے، اس بحث میں اقبال کو گھسیٹنا ان پر ظلم ہے، بلاشبہہ انھوں نے ملا پر طنز کیا ہے مگر اس سے انکی مراد وہ جامد کٹھ ملا اور ملائے مکتبی ہیں جو فکر و نظر کی صلاحیتوں سے محروم ہیں، اہل علم و صاحب نظر علماء سے نہ صرف اقبال عقیدت رکھتے تھے بلکہ ان سے استفادہ کرتے تھے، جس پر ان کے مکاتیب شاہد ہیں، پھر اگر انھوں نے ملا پر طنز کیا ہے تو اس سے کہیں زیادہ تحقیر آمیز خیالات مغرب زدوں کے متعلق ظاہر کیے ہیں، دینی امور میں وہ خود بڑے راسخ العقیدہ تھے جس پر انکا کلام اور انکی تحریریں شاہد ہیں، انکا تو مشن ہی مغرب زدگی اور مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف جہاد اور مسلمانوں میں دینی روح پھونکنا تھا جس سے انکا پورا کلام معمور ہے، "اقبال اور ملا" میں اسی نقطۂ نظر سے اقبال اور ملا کے مندرجات اور منکرین حدیث کی خرافات کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔

"م"

جلد ۷۹ ماہ رجب المرجب ۱۳۷۶ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۵۷ء نمبر ۲

مضامین

شذرات

صدق جدید میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے کسی اہل قلم عقیدتمند نے انکی سوانحعمری کی تالیف کیجانب توجہ دلائی ہے، اور اس کے متعلق مفید مشورے بھی دیے ہیں، انکا یہ مخلصانہ جذبہ قابلِ قدر ہے، بعض بزرگوں نے بھی ادھر توجہ دلائی ہے، اور کبھی کبھی اسکے متعلق استفسارات بھی آتے رہتے ہیں، اسلیے مناسب معلوم ہوا کہ اس بارہ میں تھوڑی سی تفصیل عرض کردیجائے، حضرت سید صاحبؒ کی وفات کے بعد ہی سے نہ صرف انکی سوانح عمری کی تالیف بلکہ ان کے مقالات و مکاتیب کی ترتیب و اشاعت بھی پیش نظر ہے، مگر مختلف اسباب کی بنا پر ابھی ان کاموں کو شروع نہیں کیا جا سکا، لیکن ابھی کچھ ایسا وقت بھی نہیں گذرا ہے کہ اس کو تاخیر کہا جا سکے، سوانحعمری اور مقالات کی ترتیب انشاءاللہ جلد ہی شروع کیجائیگی، اور امید ہے کہ مقالات کی پہلی جلد اسی سال مرتب ہو جائیگی، مکاتیب کی ترتیب سب سے آخر میں ہوگی، مگر شایقین کی تشفی کیلیے معارف میں انکی اشاعت کا سلسلہ اسی مہینہ سے شروع کر دیا گیا ہے جو انشاءاللہ قائم رہیگا،

حضرت سید صاحبؒ کی سوانحعمری کی تالیف بڑا اہم کام ہے، انکی ذات بڑی جامع و ہمہ گیر تھی، ان کے کاموں کا دائرہ نہایت وسیع تھا، وہ ایک مستقل مکتب خیال کے بانی یا کم سے کم اسکو کمال تک پہنچانے والے تھے، اور اسلامی علوم و فنون کا کوئی شعبہ اور قوم و ملت کی زندگی کا کوئی گوشہ انکے کارناموں سے خالی نہیں ہے، اسلیے انکی سوانحعمری تنہا ایک شخص کے حالات نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تقریباً نصف صدی کی پوری علمی و مذہبی اور قومی و ملی تاریخ ہوگی، اور ایسے اہم کام کے لیے کچھ وقت درکار ہے،

مضمون نگار نے جس اخلاص سے اس ضرورت کی طرف توجہ دلائی ہے اسکے لیے ہم انکے شکر گذار ہیں، مگر عام شایقین کا یہ حال ہے کہ جب تک سلیمان نمبر نہیں نکلا تھا، اسکے تقاضہ کے لیے خطوط کا تانتا بندھا رہتا تھا، اور معلوم ہوتا تھا کہ یہ نمبر نکلتے ہی ختم ہو جائیگا، مگر اسکو شائع ہوئے ڈیڑھ سال ہو چکا ہے اور کل پندرہ سو چھپا تھا، اور ابھی نصف کے قریب باقی ہے، اس میں معارف کے خریداروں کی خریداری بھی شامل ہے، اسی پر حیات سلیمانی کو بھی قیاس کرنا چاہیے، بلکہ اسکی اشاعت تک یہ جذبہ اور بھی سرد پڑ جائیگا، یہ صحیح ہے کہ سلیمان نمبر اور سوانحعمری کی حیثیت مختلف ہے، سلیمان نمبر حیاتِ سلیمانی کا محض ناتمام نقش یا اجمالی خاکہ ہے اور سوانحعمری کامل مرقع ہوگا، مگر اس سے شایقین کی طلب کی حقیقت بہرحال ظاہر ہو جاتی ہے،

مضمون نگار نے اس سلسلہ میں جو مشورے دیے ہیں، ان سے انشاءاللہ پورا فائدہ اٹھایا جائیگا، اور اس کام کیلیے جن اصحاب علم کے نام انھوں نے پیش کیے ہیں، نہ صرف ان سے بلکہ اگر ضرورت ہوئی تو دوسرے اصحاب علم و قلم سے بھی مدد لیجائیگی، انکا یہ خیال بھی صحیح ہے کہ "سید صاحب کی جیسی شخصیتیں کسی خاص جماعت یا گروہ کی نہیں، بلکہ تمام اہل علم کی ملک ہوتی ہیں، اور انکی سوانحعمری کی تالیف کی اہلیت اور اس کا حق صرف ندوہ اور دارالمصنفین والوں تک محدود نہیں ہے، بلکہ تمام اہل قلم کو اسکا حق ہے" ہم کو اس خیال سے پورا اتفاق ہے، اگر کوئی صاحب علم اس حق کو کام میں لانا چاہیں تو اسکے مجاز ہیں، بلکہ اگر وہ دارالمصنفین سے مدد چاہیں گے تو انکو ہر ممکن مدد دیجائیگی، سچی عقیدت و محبت میں رقابت کے بجائے اخوت اور باہمی معاونت ہوتی ہے، ماشاءاللہ خود مضمون نگار میں اسکی پوری اہلیت موجود ہے جس پر ان کا مضمون شاہد ہے، باقی دارالمصنفین کو تو بہرحال یہ کام انجام دینا ہے، دوسروں کیلیے تو یہ فرض کفایہ ہے، مگر دارالمصنفین کے لیے فرض عین ہے،

ہمارے صوبہ کی حکومت ہندستانی اکیڈمی الہ آباد کے دستور میں جو ترمیم کرانا چاہتی ہے اسکا تذکرہ گذشتہ

وینہ کے شذرات میں ہو چکا ہے. اس ترمیم سے اردو کا نام بھی اکیڈمی سے مٹ جاتا، یہ مسرت کا مقام ہے کہ بعض ہندو ممبروں کی شرافت اور رواداری سے ۲۸ر جنوری کے جلسہ میں جو تجویز منظور ہوئی اس میں اردو باقی رکھی گئی ہے، اور اب اکیڈمی کا مقصد ہندی کے ساتھ اردو، اودھی، بگھیلی اور بھوجپوری وغیرہ کی خدمت اور ترقی بھی قرار پایا ہے، گو اس ترمیم کے بعد اکیڈمی میں اردو کی پہلی پوزیشن باقی نہ رہے گی تاہم موجودہ حالات میں یہ بھی غنیمت ہے، اس سے کم سے کم اردو کا نام باقی رہ جائیگا، ممکن ہے اسکا کچھ کام بھی ہو،

ہندی تو اس صوبہ کی حکومت کی سرکاری زبان ہو ہی چکی ہے، اسکی ترقی کیلئے اسکے سارے ذرائع وقف ہیں، اس کے علاوہ خود اس صوبہ میں ہندی کے کئی ادارے موجود ہیں، اسلیے اگر ایک ادارے میں ہندی کے پاس میں اردو کی جگہ بھی باقی رکھی جائے تو اس میں کیا حرج ہے، ایک ایسے ادارے سے جسکے ممتاز بانیوں میں سر سپرو بھی تھے، اردو کو نکالنا انکی ایک عزیز یادگار کو مٹانا اور زبان کے مسئلہ میں اسکو حکومت کی پالیسی پر چلنے کے لیے مجبور کرنا اکیڈمی کے علمی وقار کے خلاف ہے،

مولانا عبد الباری صاحب ندوی نے حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تجدیدات کی ترتیب و اشاعت کا جو مفید سلسلہ لکھا ہے، اس سے دینی حلقہ واقف ہے، اس سے انکا مقصد مالی منفعت نہیں بلکہ خالص دینی خدمت ہے، چنانچہ انھوں نے اس کی آمدنی اس کی طباعت و اشاعت کے لیے وقف کر دی ہے، اور اب انھوں نے اس سلسلہ کی چاروں کتابوں یعنی جامع المجددین، یا تجدید دین کامل، تجدید تصوف، تجدید تعلیم و تبلیغ اور تجدید معاشیات کو فروخت اور آیندہ طبع و اشاعت کے لیے مکتبہ دار المصنفین کے حوالہ کر دیا ہے، اور اب وہ آیندہ یہیں سے ملیں گی،

مقالات

دیوان حافظ میں الحاق

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب، لکھنؤ یونیورسٹی

(۲)

حافظ کا مذہب

ادھر چند دنوں سے ایران میں ہر شاعر و ادیب کے مذہبی معتقدات کے معلوم کرنے کا خیال بڑی شدت پکڑ رہا ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ سوانح عمری کے ضمن میں ایک باب عموماً مصنف کے مذہب سے متعلق ہوتا ہے، اگرچہ حافظ کے سلسلہ میں بہت کام ہو رہا ہے، پھر بھی ان کی عظمت کے اعتبار بہت کم ہے، تاہم قابل ذکر ضرور ہے، اس لیے حافظ کے مذہب سے بھی ان کو کافی دلچسپی ہے اور وہاں کی اکثریت کا یہی خیال ہے کہ حافظ کا مذہب تشیع تھا، چنانچہ ایک بار میں حبیب یغمائی (شاعر معروف و مدیر مجلہ یغما) کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ نوروز کی تعطیلات میں شیراز سے واپس آئے تھے، اور وہاں کے تاثرات تازہ تھے، فرمانے لگے سعدی کا جو مقام ہے اس کے اعتبار سے انکی قدر اہل شیراز خصوصاً اور اہل ایران عموماً نہیں کرتے، اس کے برعکس حافظ کے ساتھ غیر معمولی عقیدت رکھتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ حافظ کے تشیع میں کسی قسم کا شبہہ نہیں، اور سعدی شیعہ ثابت نہیں ہو سکتے، موصوف چونکہ سعدی کے بڑے مداح ہیں، اس لیے اہل شیراز کے اس رویے سے نالاں تھے،

میرے پیش نظر اس وقت جتنی کتابیں ہیں، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے پہلے سید عبدالرحیم خلخالی نے حافظ کے دیوان کے غائر مطالعے کے بعد حافظ کے مذہب کے متعلق مختصر مگر سچی بات لکھی تھی،[1]

در موضوع عقیدہ و مذہب خواجہ بسط مقال را احتیاجی نیست زیرا کسانیکہ دیوان خواجہ را مطالعہ کردہ و با بیانات او آشنائی دارند میدانند کہ این استاد صریح البیان در قرن هشتم ہجری کہ تعصبات جاہلانہ در شدت غلیان، و کرشمہ ہای منبری عوام فریبی در اوج کمال، و خانقاہ و صومعہ پر از خرقہ پوشان و معرفت فروشاں بود "زدیم بر صف رنداں و ہرچہ بادا باد" گفتہ بدون آنکہ از تکفیر و تفسیق پروائی کند افکار و عقاید خود را.. مصور و مجسم کردہ در معرض نمایش عمومی گذاشت... جنگ و جدلہای مذہبی را افسانہ و پیروان آں را از درک حقائق بیگانہ دانستہ بل پردۂ خرافات و موہومات را دریدہ گرد و شیدۂ ابرکندہ سبحہ و سجادۂ تزویر زاہد دور افگندہ و در مقابل ریاکاراں و ارباب تزویر ایستادہ با صراحت لہجہ "نقد ہا را بود آیا کہ عیاری گیرند"...... این وصف چون و چرا یا تطویل کلام در عقیدہ خواجہ جز عوض خود بیاد دادن و زحمت خوانندہ را فراہم آوردن نتیجۂ دیگری نخواہد داد...... ولی تحقیق اینکہ خواجہ ظاہراً درچہ مذہب تولد یافتہ و پیرو کدام یک از مذاہب اسلامی بودہ است نگارندہ را تحقیقاً چیزی معلوم نشد، اگر قصیدۂ معروف:

مقدری کہ ز آثار صنع کرد اظہار	سپہر و مہر و مہ و سال و ماہ و لیل و نہار

وہم چنیں غزل مشہور

ای دل غلام شاہ جہاں باش شاہ باش	پیوستہ در حمایت لطف الہ باش

بالتمام از خواجہ باشد در تشیع او تردیدی نخواہد بود۔"

[1] مقدمہ دیوان ص "یو"

ظاہر ہے کہ جب خواجہ حافظ نے ہر جگہ اپنے کو مذہبی تنگ نظری سے بالاتر رکھا ہے تو انکے معتقدات کی تلاش ضروری نہیں، ہاں اگر کسی طرح اس کی تحقیق ہو جائے تو غیر مناسب بھی نہیں، قول بالا میں یہ سقم ضرور باقی رہ جاتا ہے کہ جیسے دونوں نظمیں کسی قدیم نسخے میں نہیں اور ساتھ ہی نہایت سست و مبتذل، حافظ کے کلام سے متفاوت اور ان کے معتقدات کے خلاف بھی ہیں، تو پھر صریح طور پر اس بات کا اظہار کر دینا چاہیے کہ ان الحاقی چیزوں سے حافظ کو شیعہ ثابت کرنے کی کوشش غیر مستحسن ہے۔

اس کے بعد مشہور محقق مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے خلخالی کے مرتب کیے ہوئے دیوان کی تقریظ کے ضمن میں ۱۳۰۶ھ میں چند جملے حافظ کے مذہب کے متعلق لکھے تھے، یہ مقالہ بعد میں بیست مقالہ قزوینی کی جلد دوم کے ساتھ کتابی صورت میں آگیا، وہ لکھتے ہیں[1]:

یک کلمہ نیز راجع بمذہب خواجہ اشارہ کردہ مقالہ را ختم میکنم چنانچہ ناشر فاضل در صفحہ "یو" "از دیباچہ مرقوم داشتہ اند اگر...... تردیدی نخواہد بود و باوجود اینکہ این قصیدہ و این غزل از بہترین اشعار نیست معذلک برای نجات اخروی خواجہ باید آرزو کرد کہ ہر دو از خواجہ باشد و الحاقی...... نباشد، در ہر صورت کسی کہ مشرب وی ایں بودہ کہ

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ	چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

البتہ مستبعد است کہ بمذہب دون مذہبی تقیدی داشتہ یا نسبت بتشیع یا تسنن تعصبی می ورزیدہ است و علی ای حال بغیر دو قصیدہ و غزل مشکوک مذکور را دلیلی بر تشیع و تسنن

[1] ج ۲ ص ۱۰۰-۱۰۱ ڈاکٹر قاسم غنی نے تاریخ عصر حافظ میں (ص ۱۷۵-۱۷۹) حافظ کے مذہب کے سلسلے میں بعینہ یہی عبارت نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اس سلسلے میں انھیں بھی کوئی مستحکم ثبوت بہم نہیں پہنچ سکے ہیں، ان کی کتاب "حافظ شیریں سخن" کے بعد چھپی ہے (۱۳۶۱ھ)

شخص حافظ بطور یقین در دست نداریم ولی در خصوص مذہب رسمی اہالی فارس در عصر خواجہ

دلیل قطعی در دست داریم کہ مذہب سنت وجماعت بودہ است و آں عبارت است

از مسکوکات سلاطین حاکمہ آں عصر در فارس یعنی آل مظفر کہ امروز باقی است و در روی

آنہا عموماً اسامی خلفاء اربعہ منقوش است"

اس ضمن میں ایک بات یہ عرض کرنے کی ہے کہ یہاں جس قصیدہ سے اور غزل کو انھوں نے "بہترین اشعار منت" کہا ہے، اور صرف "مشکوک" قرار دیا ہے، اس کے متعلق دوسری جگہ اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے[1]

"بلکہ تقریباً بنحو قطع ویقین ..... الحاقی است و ...... بدون ہیچ شک وشبہہ

از خواجہ نیست چہ علاوہ بر فقدان ..... در عموم نسخ قدیمہ ہم از حیثیت سبک و اسلوب

وہم از حیث مضامین وافکار ومشرب نیز ..... بعد المشرقین است ومخصوصاً بعضی ...

فی الواقع سخیف ترین و رکیک ترین وسست ترین اشعاری است کہ ہرگز بمخیلۂ کسی خطور

تواند کرد" الخ

دوسری بات یہ کہ جب "بنحو یقین وقطع" ان کا الحاقی ہونا ثابت کر چکے ہیں تو پھر نجات اخروی کی امید میں اس کے الحاقی ہونے کی آرزو غیر ضروری ہے۔

ڈاکٹر محمد معین نے "حافظ شیریں سخن" میں اس موضوع پر بڑی گہری اور تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان تمام قرائن کی تفصیل بیان کر دی ہے، جن سے ان کو شیعہ یا سنی سمجھا جا سکتا ہے، پھر اس پر خود تبصرہ کیا ہے، مثلاً ان کے تشیع کے حسب ذیل قراین درج کیے ہیں:

۱۔ حافظ کا ایک قصیدہ ہے:

[1] مقدمہ دیوان حافظ مصححہ قزوینی وغنی ص قید، یہ پوری عبارت اس سے قبل نقل ہو چکی ہے[2] ص ۲۰۵-۲۰۹

مقدری کہ ز آثار صنع کرد اظہار — سپہر و مہر و مہ و سال و ماہ و لیل و نہار

اس کے ضمن میں ۳ بیت میں نبی اور ولی کی مشترک توصیف ہے، ۲ بیت حضرت علیؓ، اور حضرت حسنینؓ کے لیے مخصوص ہیں، آخر میں کہتے ہیں،

بدشمناں منشیں حافظ و تولا کن — نجات خویش طلب کن بجاں ز ہشت و چہار

"ہشت و چہار" سے مراد بارہ امام ہیں۔

۲۔ غزل ذیل بھی حافظ کی منظومہ ہے،

ایدل غلام شاہ جہاں باش شاہ باش — پیوستہ در حمایت لطف الہ باش

چوں احمدم شفیع بود روز رستخیز — گو ایں تن بلاکش من پرگناہ باش

آنرا کہ دوستی علی نیست، کافر است — گو زاہد زمانہ و گو شیخ راہ باش

امروز زندہ ام بولائے تو یا علی — فردا بروح پاک اماماں گواہ باش

قبر امام ہشتم، سلطان دین رضا — از جاں ببوس و بر در آں بارگاہ باش

حافظ طریق بندگی شاہ پیشہ کن — وآنگاہ در طریق چو مردان راہ باش

یہ غزل حافظ کے مزار پر کندہ ہے،

۳۔ یہ غزل بھی حافظ ہی کی ہے:

طالع اگر مدد دہد دامنش آورم بکف — گر بکشم زہی طرب، ور بکشد زہی شرف ....

حافظ اگر قدم زنی در رہ خاندان بصدق — بدرقۂ رہت شود ہمت شحنۂ النجف[1]

"شحنۂ النجف" سے مقصود حضرت علیؓ کی ذات ہے، اور خاندان سے مراد "اہل بیت نبیؐ" ہے،

۴۔ یہ بیت بھی حافظ کی منظومہ ہے:

[1] پژمان وقزوینی وخلخالی: شحنۂ نجف

شمع جمع آفرینش شاہِ مرداں است و بس — گر توئی از جاں غلامِ شاہِ مرداں غم مخور

"شاہ مرداں" سے مراد حضرت علیؑ ہیں،

۵- حافظ کی ایک رباعی یہ ہے:

مردی ز کنندۂ درِ خیبر پرس — اسرارِ کرم ز خواجۂ قنبر پرس

گر تشنۂ فیض حق بصدقی حافظ — سرچشمۂ آں ز "ساقی کوثر" پرس

"ساقی کوثر" سے حضرت علیؑ ہی کی ذات مقصود ہے،

۶- ایک رباعی کا دوسرا شعر یہ ہے:

تا کے بود ایں گرگ ربائی؟ بنمای — سرپنجۂ دشمن افگن ای شیر خدای

۷- محمد گل اندام نے اپنے مقدمہ میں نعت پیغمبر کے بعد لکھا ہے:

خصوصاً امام المغارب والمشارق وجامع اصناف المعارف والحقایق قائل کلمہ "انا کلام اللہ الناطق" اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والتحیۃ والاکرام

اس کے بعد تین[1] بیت ہیں،

اس سے محمد گل اندام کا شیعہ ہونا واضح ہے، اور چونکہ وہ حافظ کے بڑے مقرب تھے، اس اعتبار سے قیاس ہوتا ہے کہ حافظ کا بھی یہی مذہب رہا ہوگا،

۸- حافظ کہتے ہیں:

کجاست صوفیِ دجال چشمِ ملحد شکل — بگو بسوز کہ مہدی دین پناہ آمد

حضرات شیعہ ظہور مہدی اور دجال کے معتقد ہیں، جبکہ اہل تسنن کا اعتقاد ایسا نہیں ہے،

۹- حافظ کی ایک بیت یہ ہے:

۱؎ یہ ابیات نقل ہو چکی ہیں،

ز جان محب رسول است و آلِ او — بر ایں سخن گواست خداوند اکبرم

اسی غزل کی وجہ سے حافظ کی قبر شاہ اسمٰعیل صفوی کے ہاتھوں خراب ہونے سے بچ گئی،

۱۰- دائرۃ المعارف برٹانیکا قصیدۂ مذکور (نمبر ۵) کو حافظ کی ملک قرار دیتے ہوئے انکو شیعہ بتایا ہے، اور اس قصیدہ کا بعض دیوانوں سے حذف ہونا "سودی" مفسر دیوان حافظ کے تعصب کی بنا پر تھا،

۱۱- تصوف کے تقریباً تمام سلاسل حضرت علیؓ پر ختم ہوتے ہیں، حافظ عارف ہونے کی وجہ سے خاندان اہل بیت سے بہت زیادہ عقیدت رکھتے تھے،

یہ ہے خلاصہ جو ڈاکٹر محمد معین نے درج کیا ہے، پھر وہ ان دلائل کی اس طرح جرح[1] و تعدیل کرتے ہیں:

(۱) یہ قصیدہ بہت سست ہے، اور قدیم نسخوں میں پایا نہیں جاتا، علاوہ بریں آخر میں دو بیت

حرامزادہ و بدفعل و شوم و بی بنیاد — بمدح شاہ جہاں کی کجا کند اقرار

متابعت بمنافق چہ میکنی بگذر — زیاد گفتن نامش ہزار استغفار

حافظ جیسے عارف کی طرف اس طرح کی لعن طعن منسوب نہیں کیجا سکتیں،

(۲) یہ غزل قدیم نسخوں میں نہیں ہے، اور حافظ کی اور غزلوں کی طرح متانت سے عاری ہے،

(۴) یہ بیت کسی قدیم نسخے میں پائی نہیں جاتی، بالکل الحاقی ہے،[2]

(۹) یہ بیت معتبر خطی نسخوں میں نہیں پائی جاتی، آخر میں وہ یہ محاکمہ کرتے ہیں:

"از غزل دیگر و دو رباعی خواجہ و دیگر دلائل میتواں بہ تشیع خواجہ معتقد بود"

اس سلسلے میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ (۷) مقدمہ میں نعت کے بعد کا یہ حصہ الحاقی ہے کیونکہ

۱؎ حافظ شیریں سخن ص ۳۱۱ ۲؎ ص ۳۱۲

کسی قدیم نسخہ میں نہیں، چنانچہ مرزا محمد قزوینی نے لکھا ہے:

بدون شک الحاقی میباشد از متاخرین در عہد صفویہ بقصد اینکہ خواجہ را نظر بعض مصالح شیعہ قلمداد کنند (دیوان قزوینی ص "عز" حاشیہ)

نیز "گل اندام" کو جامع دیوان قرار دینا بھی صحیح نہیں، مرزا محمد نے اس سلسلے میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، ملاحظہ ہوں چند جملے[1]:

ایں فقرہ یعنی اینکہ در ہفت نسخہ از یازدہ نسخہ از ایں مقدمہ ابدا اسمی از جامع دیوان حافظ بنا بر مشہور دریں اواخر محمد گلندام نامی بودہ بردہ نشدہ بدون ہیچ شک و شبہہ تولید شک عظیمی در صحت و اصالت نام محمد گلندام می نماید وایں احتمال را در ذہن تقویت می نماید کہ شاید ایں نام الحاقی باشد از یکی از متاخریں گمنام[2] ..... الخ

بہر حال جس جملے سے گل اندام کا تشیع ثابت ہوتا ہے، اس کے الحاقی ہونے میں کسی قسم کا شبہہ نہیں، اس لیے اس قیاس سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہو وہ بھی بے بنیاد ہو جاتا ہے،

(۹) یہ بیت بھی الحاقی ہے، کسی قدیم نسخے میں نہ ہونے کے ساتھ ساتھ حافظ کے افکار و خیالات کے بالکل منافی ہے،

(۱۰) دائرۃ المعارف کے قول کی بنیاد جب الحاقی قصیدہ پر ہے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں باقی رہ جاتی،

---

[1] مقدمہ دیوان ص "قز" [2] اس کے بعد بھی دو قرینے بتائے ہیں، اول یہ کہ دولت شاہ کے سامنے یہ مقدمہ تھا، مگر اس نے کوئی نام نہیں دیا، دوسرے "سودی" نے کسی مخصوص شخص کی طرف یہ مقدمہ منسوب نہیں کیا، مگر ڈاکٹر معین دولت شاہ کی نسبت سے گل اندام کا نام درج کرتے ہیں (حافظ شیریں سخن ص) لیکن میرے خیال میں یہ بڑا اشتباہ ہے کیونکہ اول تو دولت شاہ کے تذکرہ میں اسکا نام نہیں آیا، دوم خلاصۃ الاشعار (۱۰۱۶ھ) میں بھی نہیں، حالانکہ اس میں حافظ کے حالات دولت شاہ سے ماخوذ ہیں،

(۱۱) یہ بحث اس سلسلے میں غیر ضروری ہے کہ جب سارے سلاسل صوفیہ حضرت علیؓ پر ختم ہوتے ہیں تو اس میں تو حافظ کی کوئی خصوصیت نہیں، اور اس سے ان کے عقائد مذہبی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، ممکن ہے ڈاکٹر موصوف یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہوں کہ ان کے تصوف سے کسی کو تسنن کا دھوکا نہ ہونا چاہیے،

البتہ نمبر ۳ کی غزل، نمبر ۵، ۶ کی دو رباعیاں ایسی ہیں جن سے حافظ کی اس غیر معمولی عقیدتمندی کا ثبوت ملتا ہے، جو خاندان رسول اور حضرت علیؓ کے ساتھ تھی، لیکن یہ دلائل ایسے نہیں جن کی وجہ سے بطور قطع و یقین ان کو شیعہ کہا جا سکے، ان کے اس میلان کا یہ نتیجہ البتہ نکلا کہ لوگوں کو انکے دیوان میں طرح طرح سے الحاق کا موقع مل گیا، جس کی بنا پر ان کے بعض افکار و خیالات کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی، جن الحاقات کا ذکر دیوان کے سلسلے میں اور یہاں بھی ہو چکا ہے وہ صرف بطور نمونہ مشتے از خروارے ہیں، جسین تہرانی کے مرتبہ دیوان میں الحاق کے اور بہت سے نمونے ملیں گے جن میں چند کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جاتا ہے،

(۱) ثنا گویم کریمے را کہ بی مثل است بی ہمتا[1] — پس از ان نعت پیغمبر ز جان و دل کنم انشا

سحرگہ خواجۂ قنبر وصی نفس پیغمبر — امیر المومنین حیدر خدیو دلدل و شہبا

الا ای دشمن ناکس چو شیطان لعین خس — ترا این لعن باشد بس کہ گشتی یار با اعدا

بیا بشنو سخن از من مشو با شیر دل دشمن — ز دل بیخ جفا برکن ز جان ترک دغا بنما

(۲) آن گلبن باغ وفا آن سرو بستان صفا — خورشید برج ارتضی یعنی علی مرتضی

بدر الدجی صدر التقی کہف الوری زین الہدی — نجم العلی شمس الضحی یعنی وصی مصطفی

(۳) بعزم آنکہ کنم توبہ از محبت غیر — شنیدم آیت "توبوا الی اللہ" از لب جد

---

[1] دیوان ص ۳۲۸ بعد، پہلے تین قصیدے ہیں اور آخری دو مسدس، یہ الحاقی نظمیں صرف اہل بیت کی مدح میں ہیں،

ازیں سپس من و عیشِ شراب مرتضوی | حدیث بیند و دانش خدایگان سرور

(۴) دوش بودم در طواف روضۂ خیر الانام | شاہ سلطانِ خراسان آں امام ابن الامام

آں امامی کز شرف دانش بود بر وی تمام | کعبۂ اہل خراسان قبلۂ ہر خاص و عام

بودہ اندر روضۂ اش کامد بگوشم ایں کلام

السلام الحضرت شاہِ خراسان السلام

(۵) دوش بودم زخوف بی علی | تا سحر بانیاز و درد دلی

ہاتفی گفت کای محبِ علی | تا بکی درمیانِ آب و گلی

گو ہی تا نبودت زدین خللی

کہ سلام علی علی ولی

ڈاکٹر محمد معین[1] نے حافظ کے تسنن کے حسب ذیل دلائل دیے ہیں:

(۱) حافظ کہتے ہیں:

من ہماندم کہ وضو ساختم از چشمۂ عشق | چار تکبیر زدم یکسرہ بر ہر چہ کہ ہست

شیعہ مذہب میں نماز میت میں پانچ تکبیریں ہوتی ہیں لیکن سنیوں کے یہاں صرف چار ہیں،

(۲) حافظ بہاء الدین امام اہل تسنن کو مقرب الٰہی جانتے ہیں:

بہاء الحق والدین طاب مثواہ | امام سنت و شیخِ جماعت

چو میرفت از جہاں ایں بیت می خواند | بر اہل فضل و اربابِ براعت

بطاعت قرب ایزد میتواں یافت | قدم در نہ گرت ہست استطاعت

بدیں دستور تاریخ وفاتش | بروں آر از حروف "قرب طاعت"

[1] حافظ شیریں سخن ص ۳۰۱-۳۰۵

(۳) بعض لوگوں نے حافظ کے حسب ذیل بیت سے استدلال کیا ہے کہ وہ اشعری مذہب کے ماننے والے تھے۔

بحقِ کلامت کہ آمد قدیم | بحقِ رسول و بخلقِ عظیم

در کوی نیکنامی ما را گذر ندادند | گر تو نمی پسندی تغییر دہ قضا را

ایں جانِ عاریت کہ بحافظ سپرد دوست | روزی رخش ببینم و تسلیم وی کنم

مذہب اشعری کے اصول میں قدمِ قرآن، عدمِ تغییرِ قضا، اختیار نداشتن بندہ، و رویت باری در یوم الموعود خصوصیت سے قابل ذکر ہیں،

(۴) حافظ کہتے ہیں:

ببیں ہلالِ محرم بخواہ ساغرِ راح | کہ ماہ امن و امان ست سالِ صلح و صلاح

محرم عزا کا مہینہ ہے، اس میں کوئی شیعہ شراب خواری کی تلقین نہیں کر سکتا،

(۵) حافظ کے زمانے میں اہالی فارس مذہب تسنن کے پیرو تھے (آ) مرزا محمد قزوینی لکھتے ہیں:

در خصوص مذہب رسمی اہالی فارس در عصر خواجہ دلیل قطعی در دست داریم کہ مذہب سنت و جماعت بودہ است و آں عبارت ست از مسکوکات سلاطین[1] حاکمہ آں عصر در فارس یعنی آل مظفر کہ امروز باقی است و در روی آنہا صریحاً اسامی خلفاء اربعہ منقوش ست"

ا۔ سکہ مبارز الدین محمد، نقرہ کاشان، ۷۵۵ھ

روے | پشت

ابوبکر
لا الہ الا اللہ
عثمان | ضرب
المعتضد باللہ
السلطان محمد بن المظفر
خلد اللہ ملکہ
کاشان

[1] ر۔ک فہرست مسکوکات لین پول ج ۶ ص ۲۳۶

۲۔ سکہ شاہ شجاع (۷۵۹ھ۔ ۷۸۶ھ)

روے

ضرب ایذج ۷۶۲ھ
لا الٰہ الا اللہ
محمد
رسول اللہ
ضرب
ایذج
عثمان

پشت

باللہ
المعتضد والسلطان
ضرب
المطاع شاہ شجاع
ایذج
خلد اللہ ملکہ
اثنی ستین (کذا)

اور اسی طرح شاہ شجاع کے دوسرے سکے جو ۷۶۳ھ اور ۷۷۱ھ میں شیراز میں اور ایک ۷۶۳ھ، ۷۶۸ھ میں کاشان میں اور ۷۶۲ھ میں یزد میں اور لار اور کازرون میں ڈھلے تھے، ان سب میں بغیر استثنا خلفاے راشدین کے نام منقوش ہیں، البتہ شاہ منصور کا ایک سکہ ایسا ہے جو شیراز میں ڈھلا تھا، اور جس پر خلفا کے نام نہ تھے[۱]،

(ب) امیر مبارز الدین نے ۷۵۵ھ میں محاصرہ اصفہان کے موقع پر مصر کے خلیفہ ابوبکر معتضد باللہ کے ایلچی کے ہاتھ پر بیعت کی، اور جس طرح اس سے قبل شیخ ابو اسحٰق اینجو نے خلیفہ کا نام خطبہ اور سکہ میں جاری کیا تھا، امیر مذکور نے بھی وہی طریقہ جاری رکھا، اور عراق و فارس و یزد کے علما کو خلیفہ کی بیعت پر مائل کیا، شاہ شجاع نے بھی یہ سنت برقرار رکھی اور ۷۷۰ھ میں علماے دین کو "القاہر باللہ محمد بن ابوبکر" خلیفہ مصر کی بیعت پر متوجہ کرکے اس کا نام خطبہ اور سکہ میں شامل کیا،

اس کے بعد ڈاکٹر معین[۲] نے ان قراین پر جرح کی ہے:

---

[۱] ڈاکٹر غنی کے پاس بھی ایک سکہ شاہ شجاع کے عہد کا ہے جس پر یہ عبارت ہے [تاریخ عصر حافظ ۱۷۹، ج ۱)

روی :-

ابوبکر
لا الٰہ الا
علی اللہ محمد عمر
رسول اللہ
عثمان

پشت :-

ضرب
امیر المومنین
والسلطان المطاع
شاہ شجاع خلد
اللہ ملکہ

[۲] حافظ شیرین سخن ص ۳۰۹ - ۳۱۱

(۱) یہ دلیل "مثبت" نہیں، اس بیت کی تفسیر دو طرح پر ہو سکتی ہے: (۱) بعقیدہ شیعہ (۲) بعقیدہ عرفا، حضرات شیعہ حضرت جعفر صادق سے روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا جس مردہ پر چار تکبیر کہتے وہ نفاق سے متہم ہوتا، ممکن ہے حافظ نے عالم ہستی کی پستی و حقارت کی وجہ سے اس کے لیے چار تکبیریں استعمال کی ہوں،

حضرات صوفیہ کے یہاں چار تکبیر سے مراد فناے آثاری، فناے افعالی، فناے صفاتی اور فناے ذاتی ہے،

(۲) یہ دلیل بھی سند میں نہیں لائی جا سکتی، اس لیے کہ حافظ آزادی فکر میں ضرب المثل تھے، ان کے نزدیک مذہبی تنگ نظری بے معنی تھی،

(۳) کلام اللہ کی قدامت کا اعتقاد فرقۂ تسنن کے ساتھ مخصوص نہیں، اہل تشیع بھی اس کے قائل ہیں، جیسا کہ مؤلف لطیفۂ غیبیہ نے صراحت کی ہے،

(۴) اس اعتراض کی کوئی وقعت نہیں، اس لیے کہ عرفا کے نزدیک "ظرفیت زمان" غیر اہم اور صرف "مظروف" پر ارزش ہے، نیز خواجہ کے یہاں اس طرح کی دوسری مثالیں بھی پائی جاتی ہیں، مثلاً ما را دو سہ ساغر بدہ و گو رمضان باش، اس سے قیاس غلط ہوگا کہ حافظ مسلمان نہ تھے،

(۵) اہالی فارس کے مذہب سے حافظ کے مذہبی معتقدات کا تعین صحیح نہیں ہو سکتا، اس کے علاوہ اولجاتیو نے اپنے دور حکومت میں (۷۰۳ھ۔ ۷۱۶ھ) تشیع کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا تھا، اور اس کے زمانے میں شیعہ علما، و عرفا بھی موجود تھے، جن میں شیخ صفی اردبیلی، علاء الدولہ سمنانی، امیر سید علی ہمدانی قابل ذکر ہیں،

مجھے اس سلسلہ میں صرف تین باتیں عرض کرنا ہیں، اول یہ کہ نمبر ۴ میں جس غزل کے طرف

اشارہ ہے، وہ خلخالی اور قزوینی کے نزدیک الحاقی اور پژمان کے نزدیک اصلی (نمبر ۱۰۳ ص ۷۴) ہیں،
دوسرے یہ کہ علاء الدولہ کا تشیع قطعی نہیں، اس لیے کہ (۱) حدیث میں انھوں نے صحیح مسلم رکن الدین
صائن اور رشید بن ابی القاسم سے پڑھی تھی (شرح حال علاء الدولہ سمنانی ص ۲۶-۲۷)
(۲) ان کے شیخ عبد الرحمٰن اسفراینی کے سلسلۂ تصوف میں نجم الدین کبریٰ، نجیب الدین سہروردی،
ابو بکر نساخ وغیرہ[1] شامل تھے، جو اہل سنت تھے، (۳) تیسرے یہ کہ اولجایتو (خدابندہ) [۷۰۳ھ تا
۷۱۶ھ] چھ سال تک حنفی مذہب کا پیرو رہا، ۷۰۹ھ میں اس نے خلفائے ثلاثہ کے نام سکہ
اور خطبہ سے خارج کیے (تاریخ مفصل ایران ص ۳۱۶) اور آخر میں پھر مذہب تسنن اختیار کرلیا
"در اواخر عمر امر داد کہ نام خلفا در سکہ و خطبہ داخل کنند" (تاریخ ایران ص ۳۱۸) [نیز ملاحظہ ہو
سفرنامہ ابن بطوطہ ص ۱۵۳] گویا اپنی ۱۴ سالہ حکومت کے زیادہ حصے میں وہ مذہب تسنن ہی
پر چلا، درمیان میں چند سال کے لیے شیعہ ضرور ہو گیا تھا،

ڈاکٹر موصوف نے جو دلائل حافظ کے تسنن کے سلسلہ میں پیش کیے ہیں، ان کے علاوہ
چند اور قرائن ہیں جو اسی قیاس کے موئد ہیں،

[۱] حافظ کے اساتذہ میں ڈاکٹر معین نے دوسرے اور ماخذوں سے تین نام گنائے
ہیں، (حافظ ص ۴۸)

شمس الدین عبد اللہ شیرازی، میر سید شریف جرجانی، قاضی عضد الدین ایجی۔
ان میں سے شمس الدین عبد اللہ کے متعلق تفصیل نہیں معلوم ہو سکی، بعض لوگ ان میں اور

---

[1] علاء الدولہ سمنانی ص ۳۴، علاوہ بریں امیر چوبان جس نے باوجود اولجایتو کے حکم کے شیعہ مذہب قبول نہیں
کیا تھا (تاریخ ایران ص ۳۱۶ س ۴)، کی شیخ سے عقیدت (تاریخ ایران ۵۰۹) سے بھی میرے قیاس کی تائید
ہوتی ہے، نیز ملاحظہ ہوں ان کے تعلقات کمال الدین کاشانی سے، (تاریخ ایران ایضاً)

قوام الدین عبد اللہ میں التباس کرتے ہیں، البتہ سید شریف جرجانی کی شخصیت بہت مشہور ہے،
وہ ۷۴۰ھ[1] میں پیدا ہوئے، اصلاً جرجان [یہ گرگان یعنی استرآباد] میں پیدا ہوئے، شاہ شجاع
کے زمانے میں شیراز میں درس و تدریس میں مصروف تھے، ملا سعد الدین عمر تفتازانی[2] کے معاصر تھے،
اور بعض موضوعات پر ان سے مباحثے[3] بھی ہوئے تھے، ملا سعد ہی کے توسط سے شاہ شجاع کے دربار
میں غیر معمولی امتیاز حاصل ہوا، شیراز کے قدیم مدرسہ دار الشفا[4] میں فریضۂ درس انجام دیتے تھے،
حافظ بالکل ہم سن ہونے کے باوجود ان سے کسب فیوض کرتے تھے، شیراز ہی میں ۸۲۶ھ[5] میں
وفات پائی، نسباً حسنی حسینی سید اور مذہباً حنفی تھے، شعر و شاعری سے زیادہ رغبت نہ تھی، حیات
حافظ کے حوالہ سے ڈاکٹر معین[6] نے ایک لطیفہ بھی درج کیا ہے، جس میں انھوں نے حافظ کے
اشعار کو حدیث قدسی کہا ہے،

قاضی عضد الدین عبد الرحمٰن بن احمد ایجی[7] اپنے زمانے کے مشہور ترین علما، حکما اور متکلمین
میں شمار ہوتے ہیں، ایک واسطہ سے قاضی القضاۃ ناصر الدین بیضاوی شافعی کے شاگرد تھے،
شاہ ابو اسحاق اینجو، امیر مبارز الدین اور شاہ شجاع کے زمانے میں بڑا اعزاز حاصل ہوا، شاہ شجاع
نے بعض کتابیں قاضی صاحب سے پڑھی بھی تھیں، آخر میں امیر شبانکارہ نے انھیں قید کر دیا،
اور وہیں ۷۵۶ھ[8] میں وفات پائی، حکمت و معانی و بیان و اصول میں صاحب تالیفات
ہیں، ان میں سے سب سے زیادہ مشہور "مواقف" ہے، جو علم کلام میں ہے، حافظ نے اس کی طرف اس طرح

---

[1] حافظ شیریں سخن ص ۱۸۳ مگر فہرست مدرسہ سپہ سالار ج اول ص ۱۲۳ میں ۷۴۸ھ ہے [2] وہ شافعی یا حنفی مذہب تھے
قاضی عضد کے شاگرد اور بڑے پایہ کے عالم گزرے ہیں (فہرست ج ۱ ص ۵۵۹) [3] ایضاً [4] ایضاً [5] فہرست ص ۱۲۳ میں
۸۱۶ھ ہے، نیز ملاحظہ ہو حافظ شیریں سخن ص ۱۸۳ حاشیہ ۴ [6] ایضاً ص ۱۸۴ [7] ملاحظہ ہو حافظ شیریں سخن ص ۱۸۱-۱۸۲،
فہرست جلد اول ص ۴۸۵ نیز تاریخ مفصل ایران ص ۳۵۱، ۴۱۹، ۴۲۲ [8] فہرست میں سنہ وفات ۷۵۶ھ دیا ہے اور یہی تاریخ
پژمان نے بھی دی ہے (دیوان مقدمہ ص نودم)

اشارہ کیا ہے،

دگر شہنشہ دانش عضد کہ در تصنیف — بنای کار مواقف بنام شاہ نہاد

قاضی صاحب کی دوسری تصنیف شرح مختصر ابن حاجب ہے، "مختصر ابن حاجب" اصول میں ہے، اس کے مؤلف ابوعمر عثمان بن عمر معروف با بن حاجب نے اپنی ایک دوسری کتاب "منتہی الاصول" سے مختصر کرکے لکھا ہے،

قاضی صاحب مذہباً شافعی تھے،[1] غالباً اسی بنا پر قاضی نور اللہ شوستری نے انھیں "رئیس الملا"[2] کا لقب دیا ہے، ڈاکٹر معین[3] لکھتے ہیں:

"پیداست با اہمیتی کہ قاضی عضد در دربار شاہ شجاع داشتہ وخواجہ نیز ہمین وجہ در آن دربار محترم بود باید خواجہ ازو استفادت بردہ باشد وحتی کتب وتصانیف او آشنائی داشتہ باید، دائرۃ المعارف اسلامی نیز نویسد محتمل است کہ قاضی عضد استاد حافظ بودہ باشد۔"

[۲] بادشاہوں اور وزیروں کے علاوہ حافظ نے جن جن بزرگوں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بیشتر بطور یقین اہل تسنن تھے اور کسی ایک کا بطور گمان کے بھی شیعہ ہونا ظاہر نہیں ہوتا، مثلاً حافظ کا ایک مشہور قطعہ[4] ہے

بعہد سلطنت شاہ شیخ ابو اسحٰق — بہ پنج شخص عجب ملک فارس بود آباد

نخست پادشہی ہمچو او ولایت بخش — کہ جان خویش بپرورد وداد عیش بداد

دگر مربی اسلام شیخ مجد الدین — کہ قاضی بہ ازو آسمان ندارد یاد

دگر بقیہ ابدال شیخ امین الدین — کہ یمن ہمت او کارہای بستہ کشاد

[1] فہرست ج ۱ ص ۴۸۵ [2] دیوان (پژمان) ص نوزدہم [3] حافظ شیرین سخن ص ۱۸۲

[4] دیوان خلخالی ص ۲۷۰، دیوان قزوینی ص ۳۶۳

دگر شہنشہ دانش عضد کہ در تصنیف — بنای کار مواقف بنام شاہ نہاد

دگر کریم چو حاجی قوام دریا دل — کہ نام نیک ببرد از جہان بخشش وداد

نظیر خویش بنگذاشتند وبگذشتند — خدای عز وجل جملہ را بیامرزاد

شیخ مجد الدین اسماعیل[1] بن محمد بن خداداد (متوفی ۷۵۶ھ) شیراز کے قاضی اور بادشاہ ابو اسحاق کے بڑے مقرب تھے، شیراز ہی میں انھوں نے مدرسہ مجدیہ کی بنیاد ڈالی، اور اس میں درس بھی دیتے تھے، جب سلطان اولجایتو نے مذہب تشیع کی ترویج کا فرمان صادر کیا تو قاضی مجد الدین سے مخالفت کی بنا پر انھیں لشکر میں حاضری کا حکم دیا، قراباغ میں قاضی اولجایتو کی خدمت میں حاضر ہوئے، سلطان کے حکم کے مطابق انھیں وحشی کتوں کے سامنے ڈالدیا گیا، مگر ان کو کچھ نقصان نہیں پہنچا، سلطان اس بات سے اتنا متاثر ہوا کہ قاضی کو خلعت بخشی اور خود تشیع سے تائب ہوگیا، مشہور سیاح[2] ابن بطوطہ نے قاضی مجد کے بڑے دلچسپ حالات درج کیے ہیں، قاضی صاحب سے حافظ جس قدر متاثر تھے، اس کا ایک حد تک اندازہ قطعۂ بالا سے ہوتا ہے، ان کی وفات پر جو دوسرا قطعہ لکھا ہے،[3] اس سے حافظ کی غیر معمولی عقیدت کا پتہ چلتا ہے:

مجد دین سرور سلطان قضا اسمٰعیل — کہ زدی کلک زبان آورش از شرع نطق

ناف ہفتہ بدو از ماہ رجب ثانی عشر — کہ برون رفت ازین عالم بی وضع ونسق

کنف رحمت حق منزل دی دان آنگہ — سال تاریخ وفاتش طلب از "رحمت حق"

ڈاکٹر معین[4] لکھتے ہیں:

"خواجہ حافظ بیشک محضر او را دریافتہ است وبدو اعتقادی داشتہ است۔"

[1] حافظ شیرین سخن ص ۱۷۹ - ۱۸۱ مقدمہ دیوان (پژمان) ص نوزدہم، تاریخ مفصل ایران ص ۳۱۸، ۳۲۲ بر حاشیہ

[2] ایضاً وسفرنامہ ص ۱۴۳ و تاریخ مفصل ایران (عباس اقبال) ص ۳۱۷، ۳۱۸ [3] دیوان خلخالی ص ۲۷۷، دیوان (قزوینی) ص ۳۶۹ [4] حافظ شیرین سخن ص ۱۸۱

شیخ امین الدین عارف کامل تھے، ان کا ذکر آیندہ ہوگا، اور قاضی عضد الدین کا ذکر ہوچکا ہے،

حاجی قوام الدین حسن (متوفی ۷۵۴ھ) حافظ کے بڑے ممدوح و مربی تھے، ان کی تعریف میں تین غزلیں اور تین قطعے لکھے ہیں، مثلاً

دریای اخضر فلک و کشتی ہلال — ہستند غرق نعمتِ حاجی قوام ما

نکتہ دانی بذلہ گو چوں حافظ شیریں سخن — بخشش آموزی جہاں افروز چوں حاجی قوام

بر ندی شہرہ شد حافظ میان ہمدماں لیکن — چہ غم دارد کہ در عالم قوام الدین حسن دارد

بحق نعمت حاجی قوام ما کہ قدر — ز بہر مصلحت خود بدیں رضا ندہد

سرور اہل غنائم، شمع بزم انجمن — صاحب صاحبقراں حاجی قوام الدین حسن

لیکن انکے تسنن کا یقینی علم تو نہیں ہو، مگر قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اسی مذہب کے پیرو تھے،

[۳] جتنے عرفا سے حافظ کے روابط کا پتہ چلتا ہے، وہ سب اہل تسنن تھے، مثلاً

(۱) شیخ امین الدین، بلیان گازرون کے باشندہ تھے[1]، اپنے زمانہ کے بڑے درجے کے پیر طریقت تھے، خرقۂ طریقت اپنے چچا اوحد الدین عبد اللہ بلیانی سے پایا تھا، رمضان ۷۰۱ھ میں ان ہی سے "تلقین ذکر" حاصل ہوئی، ان کی وفات ۷۴۵ھ میں ہوئی اور گازرون میں اپنی خانقاہ میں مدفون ہوئے، خواجوے کرمانی نے ان کی شان میں بہت سی نظمیں لکھی ہیں، منجملہ ان کے مثنوی گل و نوروز میں انکا[2] ذکر بڑی شد و مد سے کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں؛

امینِ ملت و دیں شیخِ اعظم — مہ برج حقیقت کہفِ عالم

معین الخلق سر اللہ فی الارض — کہ تعظیمش بود بر اہل دیں فرض

[1] ملاحظہ ہو حافظ شیریں سخن ص ۱۰۹، مقدمہ پژمان ص نو و م، مگر ڈاکٹر معین، اقبال اور پژمان نے ان ہی اور خواجہ امین الدین جہرمی ندیم شاہ ابو اسحٰق میں التباس کیا ہو، وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ عصر حافظ ص ۵۰۱ حاشیہ ۱ و ۲ و تاریخ مفصل ایران ص ۴۲۲ [2] ایضاً

مقیم راہ رو قطبِ یگانہ — چراغِ شش رواقِ ہفت خانہ

امام الواصلین سر خیلِ اوتاد — وجودش زبدۂ قانون ایجاد

الاای پیکِ رنجوران مہجور — کہ چوں موسی نہندت طائر طور

تو ئی آرام بخش جانِ مشتاق — قدومت راستی نوروز عشاق

گرت بر گازروں افتد گذاری — بکن بہرِ منِ دل خستہ کاری

علم زاں حضرت علیا برافراز — در آں بستان حضرا آشیاں ساز

ببیں در ملکِ وحدت تاجداری — بمیدان حقیقت شہسواری

ز برجِ بو علی دقاق ماہی — وز اقلیم ابو اسحاق شاہی

خواجو کرمانی کی ان سے ارادت اور ابو علی دقاق سے انکی عقیدت ان کے تسنن کا پتہ دیتی ہے،

(ب) سید ابو الوفا کا ذکر خواجہ حافظ نے ایک غزل میں[1] اس طرح کیا ہے؛

سحر بلبل حکایت با صبا کرد — کہ عشق روی گل با ما جفا کرد

گر از سلطاں طمع کردم خطا بود — ور از دلبر وفا جستم جفا کرد

وفا از خواجگانِ شہر با من — کمال دولت و دیں بو الوفا کرد

جامی نے اشعۃ اللمعات میں ان کو "قدوۃ العرفا خواجہ ابو الوفا" لکھا ہے، اور انکی طرف حسب ذیل "منظوم پرسش"[2] منسوب کی ہے،

قدوۂ اہل دانش و تقوی — بنویسد جواب ایں فتوی

کہ چہ باشد مراد شیخ جنید — رحمۃ اللہ ز رمز لون الماء

از چہ فرمودہ صاحب لمعات — عکس آنرا کہ شیخ کرد ادا؟

[1] دیوان (خلخالی) ص ۸۵ [2] حافظ شیریں سخن ص ۱۸۸

عکس آں چیست آنکہ رنگ محب   ہست رنگ حبیب بی ہمتا

اس سے سید مذکور کے تسنن کا اندازہ ہوتا ہے،

(ج) شیخ زین الدین[1] ابوبکر تایبادی علوم ظاہر میں مولانا نظام الدین ہروی کے شاگرد تھے، اور علوم باطن وروحانی میں شیخ الاسلام احمد النامقی الجامی سے کسب فیوض کیا تھا، شیخ الاسلام کیسا تھ مشہد مقدس گئے، پھر مزارات طوس کی زیارت کی، اور بابا محمود طوسی کی خدمت میں شرفیاب ہوئے، خواجہ محمد پارسا کا حسب ذیل بیان جامی[2] نے نفحات میں نقل کیا ہے،

اول بار کہ ہمراہ خواجہ بزرگ خواجہ بہار الدین قدس اللہ تعالیٰ سرہ بسفر حج میرفتیم بمرو رسیدم قافلہ دو فرقہ شدند، بعضی میل بجانب مشہد مقدس رضوی کردند وبعضی بجانب ہری کردند، مقرر بر آنکہ ہمہ در نیشاپور بہم رسند، حضرت خواجہ میل بجانب ہری کردند و فرمودند کہ میخواہم بصحبت مولانا زین الدین ابوبکر رسم، من جوان محروم واز احوال خدمت مولوی آگاہی نداشتم بمشہد رفتم ..... وگویند کہ چوں حضرت خواجہ بہ تایباد رسید نماز بامداد با خدمت مولانا بجماعت گزاردہ و در صف اول چنانچہ طریق ایشان بودہ بمراقبہ نشستہ بودند وچوں مولانا ازاورا د فارغ شدہ برخاست و پیش ایشان آمدہ معانقہ کردہ و نام پرسیدہ ، خدمت خواجہ فرمودند کہ بہار الدین مولانا گفتہ باشد کہ برای ما "نقش بند" خواجہ فرمودہ اند کہ "ما آمدہ ایم کہ نقش بریم" خدمت مولانا ایشان را بخانہ بردہ اند و دوسہ روز صحبت داشتہ اند۔"

اس سے مولانا زین الدین کا تسنن پوری طرح ظاہر ہوتا ہے،

مولانا جب حج کو جاتے ہوئے شیراز سے گزرے تھے تو یہاں حافظ کی اس بیت پر بڑا شور مچا ہوا تھا،

گر مسلمانی ہمین است کہ حافظ دارد   وای گر از پی امروز بود فردائے

[1] یہ ساری تفصیل حافظ شیریں سخن (ص ۱۸۸ تا ۱۹۱) سے لی گئی ہے [2] نفحات الانس ص ۳۲۵ ببعد

کہ حافظ "معاد" کے قائل نہیں ہیں، خواجہ مولانا کے ورود کی اطلاع پاکر انکی خدمت میں حاضر ہوئے، مولانا نے فرمایا کہ اس بیت پر ایک ایسی بیت کا اضافہ کردو تاکہ یہ بیت دوسرے کا مقولہ بن جائے، حافظ نے اس بیت کا اضافہ کیا،

این حدیثم چہ خوش آمد کہ سحرگہ میگفت   بر در میکدہ ای باد ف ونی ترسائی

اس طرح اس مصیبت سے نجات پائی، مولانا مذکور حافظ سے ایک سال قبل ۷۹۱ھ میں فوت ہوئے،

(د) شاہ نعمت اللہ[1] ولی ماہانی متوفی ۸۲۷ھ سے حافظ کے تعلقات عقیدتمندانہ تھے، چنانچہ شاہ صاحب کی حسب ذیل غزل پر ایک غزل لکھی ہے، اور ان پر تعریض کی ہے:

ماخاک راہ را بنظر کیمیا کنیم   صد درد را بگوشۂ چشمی دوا کنیم

در حبس صورتیم وچنیں شاد وخرمیم   بنگر کہ در سراچۂ معنی چہا کنیم

موج محیط وگوہر دریای عزتیم   ما میل دل بآب وگل خود چرا کنیم

رندان لاابالی ومستان سرخوشیم   ہشیار را بمجلس خود کی رہا کنیم

از خود برآ ودر صف احباب ماخرام   تا سید انزوی دلت با خدا کنیم

حافظ کہتے ہیں:

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند   آیا بود کہ گوشۂ چشمی بما کنند

دردم نہفتہ بہ ز طبیبان مدعی   باشد کہ از خزانۂ غیبش دوا کنند

معشوق چوں نقاب ز رخ در نمی کشد   ہر کس حکایتی بہ تصور چرا کنند

چوں حسن عاقبت نہ برندی وزاہدیست   آں بہ کہ کار خود بعنایت رہا کنند

حالی درون پردہ بسی فتنہ میرود   تا آنزماں کہ پردہ برافتد چہا کنند

[1] حافظ شیریں سخن ۱۹۱ - ۱۹۲ بژمان (مقدمہ دیوان) ص ۱۱۶ - ۱۱۷

می خور کہ صد گناہ ز اغیار در حجاب	بہتر ز طاعتی کہ بہ روی و ریا کنند
بی معرفت مباش کہ در من یزید عشق	اہل نظر معاملہ با آشنا کنند
حافظ دوام وصل میسر نمی شود	شاہان کم التفات بحال گدا کنند

باوجود اس کے شاہ کے تسنن کے زبردست قرائن موجود ہیں،

[۴] مقدمہ دیوان حافظ میں جدید خطی نسخوں[1] میں یہ عبارت ہے،

اما بواسطۂ محافظت درس قرآن و ملازمت شغل [یا تعلیم] سلطان و تحشیہ کشاف[2]

و مفتاح و مطالعۂ مطالع و مصباح[3] .... بجمع اشتات غزلیات نپرداخت۔"

لیکن قدیم نسخوں میں یہ "ملازمت شغل سلطان" کے بجائے "ملازمت بہ تقوی و احسان"

اور "تحشیہ" کے بجائے بحث ہے، ظاہر ہے کہ اس نسخہ سے مفہوم میں بڑا تغیر ہو جاتا ہے،

مثلاً جدید نسخوں سے حافظ کی ملازمت سلاطین وقت سے ثابت ہوتی ہے، اور بعض سے یہ

بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی بادشاہ کے معلم بھی رہ چکے تھے، دوسرا بڑا فرق یہ ہو جاتا ہے کہ بجائے

"کشف و مفتاح" کی بحث کے ان کو حاشیہ نگار تسلیم کرنا پڑے گا، بہر حال یہ مسلم ہے کہ حسب ذیل

کتابیں ان کے عمیق مطالعہ میں رہ چکی ہیں:

۱۔ کشاف (۲) مفتاح (۳) مطالع (۴) مصباح۔

غزل کے ضمن میں ایک بیت پائی جاتی ہے،

بخواہ دفتر اشعار و راہ صحرا گیر	چہ وقت مدرسہ و بحث کشف کشاف است

آخری مصرعہ اس طرح بھی پایا جاتا ہے، "چہ وقت مدرسہ و بحث کشف و کشاف است۔"

---

[1] مقدمہ قزوینی (دیوان) ص تو حاشیہ وتن [2] قدیم نسخوں کے علاوہ خلاصۃ الاشعار میں بھی "بحث" ہی ہو مگر اس میں بھی "شغل سلطان" ہی ہو [3] حافظ شیریں سخن میں ان دونوں کی ترتیب بالعکس ہونے کی بنا پر تحشیہ کا تعلق مصباح سے بتایا گیا ہے (ص ۳۶۶)

اس صورت میں کشف و کشاف دونوں کی بحث حافظ کا محبوب مشغلہ قرار پاتا ہے، "کشف" کا

پورا نام حاجی خلیفہ نے "الکشف عن مشکلات الکشاف" لکھا ہے، اس کتاب کا مؤلف

سراج الدین عمر بن عبد الرحمٰن فارسی قزوینی متوفی ۷۴۵ھ تھا[1]، یہ کشاف کی شرح یا حاشیہ ہے،

اور کشاف قرآن مجید ایک اہم تفسیر ہے[2]، اس کے مصنف علامہ ابو القاسم محمود بن عمر خوارزمی

زمخشری (۴۶۷ھ۔ ۵۳۸ھ) ہیں، یہ کتاب ۵۲۷ھ میں دو سال تین ماہ اور دس روز میں تمام

ہوئی اور یہ مدت حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ[3] خلافت کے برابر تھی، مصنف کے زمانہ سے آج تک اسکی

شہرت برابر چلی آرہی ہے، بیسیوں علما نے اس پر شرحیں اور حاشیے لکھے ہیں،

حافظ کے زمانے میں یہ بہت مشہور اور درس میں شامل تھی، حافظ کا ہمعصر و ہمشہر مؤلف

شیراز نامہ[4] لکھتا ہے:

"توضیح کشاف" را نزد ابو سعید محمد السیرانی خواندہ ام"

اور پدر ابو سعید کے متعلق یوں اظہار خیال[5] کرتا ہے:

"مدتی از طرف اتابک سعد کوچک وزارت مملکت فارس بوے مخصوص آمدہ، کتاب تنقیح

کشاف بچہار مجلد از مصنفات اوست"

اسی طرح حافظ کے استاد علامہ میر سید شریف جرجانی نے بھی کشاف پر حاشیہ لکھا تھا: جو

اب تک موجود ہے[6]، غرض ان وجوہ سے اگر حافظ نے بھی "کشاف" اور اس کے سلسلے کی دوسری

تصانیف کا عمیق طور پر مطالعہ کیا یا ان پر شرح لکھی تو جائے تعجب نہیں، ان کا قرآن کا مطالعہ بہت

دقیق تھا، جیسا کہ خود ان کے اشعار[8] سے ظاہر ہوتا ہے،

---

[1] دیوان قزوینی ص ۹۷ [2] فہرست کتاب خانہ سپہ سالار ج ۱، ص ۱۵۸ - ۱۶۱ [3] ایضاً ص ۱۵۹ [4] حافظ شیریں سخن ص ۳۶۶ - ۳۶۰، مولف کا نام ابو العباس احمد بن ابی الخیر ہے اور ۷۴۴ھ میں بقید حیات تھا [5] ایضاً [6] ملاحظہ ہو فہرست سپہ سالار ص ۱۵۹ [8] دیوان (قزوینی) ص ۳۱۲

زحافظان جہاں کس چو بندہ جمع نکرد — لطائف حکمی با نکات قرآنی

اس تفصیل سے اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ "کشف کشاف" کا مولف بھی سنی تھا، اور "کشاف" کا بھی، اس[1] سے بھی حافظ کے تسنن کا کسی قدر امکان ہو سکتا ہے،

دوسری کتاب مفتاح ہے، اس نام کی بہت سی کتابیں[2] ہیں، لیکن حافظ کے زمانے میں سکاکی کی مفتاح العلوم درس میں شامل تھی، جیسا کہ شیراز نامے[3] کے مولف کے بیان سے پتہ چلتا ہے، سکاکی کا پورا نام سراج الدین ابی یعقوب یوسف ابن ابی بکر سکاکی متوفی ۶۲۶ھ ہے، اگرچہ یہ کتاب صرف و نحو، معانی و بیان سے متعلق ہے، مگر اس کا مصنف سنی تھا،

تیسری کتاب مطالع ہے، اس عنوان سے بہت سی کتابیں[4] حکمت و کلام میں ملتی ہیں، حافظ کے عہد میں قاضی ناصر الدین بن عمر بیضاوی کی طوالع الانوار من مطالع الانظار بہت مشہور تھی، چنانچہ اکثر مصنفین[5] نے "مطالع" سے اسی کتاب کو مراد لیا ہے، "قاضی مذکور کی ایک اور کتاب مطالع فی شرح الطوالع بھی ہے، شاید یہی کتاب حافظ کے مطالعے میں رہی ہو، بہرحال کتاب مذکور کے مؤلف اہل تسنن میں مشہور مفسر گزرے ہیں، جو شافعی[6] مذہب کے پیرو تھے،

چوتھی کتاب مصباح ہے، اس نام کی بھی بہت سی کتابیں[7] عربی اور فنون دونوں میں مختلف موضوع پر لکھی گئی ہیں، مگر شیراز نامہ کے مولف کے بیان[8] سے پتہ چلتا ہے کہ قاضی ناصر الدین بیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) کی کتاب مصباح جو علم کلام پر تھی، حافظ کے زمانے میں بہت زیادہ مستند اول تھی اور خود مولف مذکور نے یہ کتاب سبقاً سبقاً پڑھی تھی، اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ قاضی صاحب ہی کی کتاب حافظ کے مطالعہ میں رہی ہے، اور چونکہ یہ علم کلام پر ہے، اور اس کا مولف شافعی المذہب ہے،

---

[1] حافظ شیریں سخن ص ۵۰۵ [2] ایضاً و حاجی خلیفہ فہرست کشف الظنون [3] ایضاً ص ۸۶-۸۷ [4] تاریخ ادبیات ایران (براؤن) شرح حال لسان الغیب ج ص ۲۳، مصنف نے ۷۰۳ھ میں اسے لکھا [5] ریحان الادب ذیل بیضاوی (چاپ طہران) [6] حافظ شیریں سخن ص ۳۶۷-۳۶۸ [7] ایضاً ص ۳۶۹

اس لیے حافظ کا تسنن قرین قیاس ہو سکتا ہے، ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں ذکر کیا ہے کہ قاضی مجد الدین[1] اپنے مدرسے میں مصباح کا درس دیتے تھے، خیال ہوتا ہے کہ مصباح سے مراد بیضاوی ہی کی تالیف ہے،

[۵] حافظ نے بعض شاعروں کے مصرعوں پر گرہیں لگائیں منجملہ ان کے یزید کے ایک مصرعہ کو الٹ کر اس کی تضمین کی، یزید کی بیت[2] یہ ہے،

انا المسموم ما عندی بتریاق ولا راق — ادر کاسا و ناولہا الا یا ایہا الساق

اس کا دوسرا مصرعہ حافظ کے دیوان کی پہلی بیت میں اس طرح آیا ہے،

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا — کہ عشق آساں نمود اول ولی افتاد مشکلہا

پژمان نے حافظ کے لطائف[3] کے ضمن میں یہ لکھا ہے:

این پاسخ دنداں شکن را ہم شفاہاً شنیدہ ام کہ شخصی بزبان اعتراض خواجہ راگفت شما چگونہ راضی شدید کہ مفتتح دیوان خویش را مصراعی از اشعار یزید ساختہ و گوئید، الا یا ایہا الخ خواجہ در پاسخ فرمود اگر گوہری از دہان سگ بیروں افتد مبتواں آں را نشستہ و برفرق نہاد

بہرحال اس لطیفے کے بعد بھی اصلی بات اپنی جگہ پر باقی رہ جاتی ہے،

تفصیلات بالا سے اندازہ ہوگا کہ اگرچہ حافظ کے تسنن کے زیادہ قوی قرینے ہیں، لیکن کوئی ایک بھی ایسا مستحکم قرینہ نہیں جس کی بنا پر کوئی بات بطور قطع و یقین کے کہی جا سکے، لیکن اسکے ساتھ ہم ڈاکٹر معین کے فیصلہ کو صحیح قرار نہیں دے سکتے[4]، جو حسب ذیل غزلی[5] اور دو رباعی[6] کی وجہ سے ان کو شیعہ مذہب

---

[1] حافظ شیریں سخن ص ۱۱۰ و سفرنامہ ص ۱۲۶ [2] دیوان حافظ (پژمان) مقدمہ ص ۱۴۳ حاشیہ نمبر ۱ [3] ایضاً و دیوان ص ۳۸۲ [4] حافظ شیریں سخن ص ۳۱۲ [5] دیوان حافظ (قزوینی) ص ۲۰۱ [6] دیوان (پژمان) ص ۲۹۱، ۲۹۳

کا پیرو قرار دیتے ہیں،

طالع اگر مدد دہد دامنش آورم بکف　　گر بکشم زہی طرب ور بکشد زہی شرف

طرف کرم ز کس نہ بست این دل پر امید من　　گرچہ سخن ہمی برد قصۂ من بہر طرف

از خم ابروی تو ام ہیچ گشایشے نشد　　وہ کہ دریں خیال کج عمر عزیز شد تلف

ابروی دوست کی شود دستکش خیال من　　کس نزدست ازیں کمان تیر مراد بر ہدف

چند بناز پرورم مہر بتان سنگدل　　یاد پدر نمیکنند این پسران ناخلف

من بخیال زاہدی گوشہ نشیں و طرفہ آنک　　مغبچۂ ز ہر طرف میزندم بچنگ و دف

بیخبرند زاہدان نقش بخوان و لا تقل　　مست ریاست محتسب بادہ بدہ و لا تخف

صوفی شہر بیں کہ چوں لقمۂ شبہہ میخورد　　پاردمش دراز باد آں حیوان خوش علف

حافظ اگر قدم زنی در رہ خاندان بصدق　　بدرقۂ رہت شود ہمت شحنۂ نجف

مردی ز کنندۂ در خیبر پرس　　اسرار کرم ز خواجۂ قنبر پرس

گر تشنۂ فیض حق بصدقی حافظ　　سرچشمۂ آں ز ساقی کوثر پرس

قسام بہشت و دوزخ آں عقدہ کشای　　ما را نگذارد کہ در آئیم ز پای

تا کے بود ایں گرگ ربائی بنمای　　سر پنجۂ دشمن افگن ای شیر خدای

اگر ان ابیات میں ایک اور غزل کی حسب ذیل[1] بیت شامل کر لی جائے تو بھی ڈاکٹر معین کا فیصلہ درست نہیں قرار پا سکتا ہے

بخیل بوی خدا نشنود بیا حافظ　　پیالہ گیر و کرم ورز و الضمان علی

حسین پژمان نے بھی بقول خود "ضعیف" دلائل کی بنا پر حافظ کو شیعہ بتایا ہے،

---

[1] دیوان (قزوینی)، ص ۲۹۹

مثلاً وہ لکھتے ہیں[1]

"معہذا بعضی دلائل گو اینکہ ضعیف باشد در دست است کہ بر شیعی بودن آں بزرگوار گواہی میدہد:

(۱) خواجہ در اشعار خود از خلفای سہ گانہ نامی نمی برد

(۲) بہ علی و خاندان او صریحاً اظہار ارادت نمودہ

(۳) ایں شعر از عقیدۂ یک نفر سنی عالم ...... دور می نماید ہے

صبا بصوفی دجال چشم ملحد شکل　　بگو بسوز کہ مہدی دین پناہ آمد

ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ نمبر ۳ میں جس بیت کا ذکر ہے، وہ نہایت مشکوک اور حافظ کے معتقدات و خیالات کے منافی ہے، اور جن اشعار سے حضرت علیؓ و خاندان اہل بیت سے بے پناہ عقیدت ظاہر ہوتی ہے، اور بعض میں خلفائے راشدین پر طعن بھی ملتا ہے، ان میں سے بیشتر الحاقی ہیں، اور صرف دو رباعیاں اور دو غزلیں ایسی ضرور ہیں جن میں حضرت علیؓ سے خصوصی ارادت ظاہر ہوتی ہے، مگر اس سے ان کا تشیع کیونکر ثابت ہو سکے گا؟ اسی طرح کی عقیدت خاندان اہل بیت اور حضرت علیؓ سے ہر سنی رکھتا ہے، اگر کوئی اس کے خلاف ہو تو وہ سنی قرار ہی نہیں پا سکتا، حسین پژمان کو اس بات کا علم نہیں تھا، جیسا کہ ان کے اس بیان[2] سے صاف ظاہر ہے:

بدیہی است کہ اہل سنت و جماعت بہ خاندان علی توجہی نداشتہ یا لااقل آنہا را در خور پیروی و متابعت نمی دانند۔ آقای فرو مرزی فرمودند" اگر شیعۂ امامیہ تنہا بہ ائمۂ دو از دہ گانہ معتقد ند اہل سنت بتمام خاندان علی عقیدت مند ند و بہ آنہا ارادت می ورزند"

.... منظور (پژمان) آں بودہ است کہ اہل سنت و جماعت مانند شیعیان خاندان علی

---

[1] مقدمہ ص ۴۳ [2] ایضاً

ستایش نمی کنند یعنی آنہا را معصوم نمی دانند و تفویضاً از آنہا پیروی نمی کنند معہذا از آقای فرامرزی بی نہایت تشکر نمودہ و خرسندم کہ لااقل مرا بکلی از اشتباہا تم آشنا فرمودند"

حسین پژمان کی شرط اول کے مطابق سارے سنی واویب و عالم سنی نہیں ثابت ہو سکتے مختصر یہ کہ حافظ کے تسنن کے دلائل تشیع کی بہ نسبت قوی ضرور ہیں، لیکن ہم یقین سے صرف اتنی بات کہہ سکتے ہیں:

"ما دلیلی بر تسنن یا تشیع شخص حافظ بنحو قطع ویقین در دست نداریم"[1] (باقی)

---

[1] یہی فیصلہ محمد بن عبد الوہاب قزوینی، قاسم غنی اور خلخالی تینوں نے کیا ہے۔

عمادی غزنوی یا عمادی شہریاری

از جناب ڈاکٹر غلام مصطفی خانصاحب ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، صدر شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی حیدرآباد

رسالہ معارف بابت مارچ ۱۹۴۷ء میں راقم الحروف کا ایک مضمون عمادی پر شائع ہوا تھا، جن میں بعض متاخرین فضلاء کی تقلید میں عمادی غزنوی کے علاوہ عمادی شہریاری کو ایک اور شاعر فرض کر لیا تھا، لیکن بعد میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (اردو) کے لیے جب اس مضمون کی تلخیص کی ضرورت پیش آئی تو غور کرنے پر معلوم ہوا کہ عمادی غزنوی اور عمادی شہریاری درحقیقت ایک ہی شاعر کے دو مختلف نام ہیں، اور آتشکدۂ آذر اور مجمع الفصحاء جیسی کتابوں کی وجہ سے اس تخلص کے دو شاعر سمجھ لیے گئے ہیں، لباب الالباب (ج ۲ ص ۲۷۰) میں "شعرائے غزنیہ و لوہور" کے ذیل میں "استاد الائمہ عماد الدین الغزنوی" نام آتا ہے، اس کا قدیم ترین کلام جو دستیاب ہو سکا ہے وہ سلجوقی سلطان ملک شاہ کے بھائی ملک ارغون (المتوفی ۴۸۹ھ/۱۰۹۶ء) کی مدح میں ہے:

ای بر سمن از مشک بعمدا زدہ خالے	مسکیں دل من گشت ز خال تو بحالے
حالے بجہاں زار تر از حال دلم نیست	تا نیست دل آشوب تر از خال تو خالے
شاہ ہمہ شاہان ملک ارغوں کہ ندارد	در رومی و فرہنگ نظیرے و ہمالے
آں قلعہ کشائے کہ ملک فلک اورا	ہر روز دہد مژدہ بعزی و جلالے
در معرکہ بستاند و در بزم ببخشد	ملکے بسوارے و جہانے بسوالے
عالم تر و عادل تر از و ہیچ ملک نیست	الا ملک العرش تبارک و تعالے

(مونس الاحرار ص ۶۹۴-۶۹۰)
حبیب گنج

سید حسن غزنوی (م ۵۵۶ھ/۱۱۶۱ء) نے اسی قصیدے کی تقلید میں خسرو شاہ بن بہرام شاہ غزنوی (۵۱۲ھ/۱۱۱۸ء تا ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء) کی مدح میں کہا تھا۔

ای یافتہ از چہرۂ تو حسن کمالے   دادہ ست جمالیت خداوہ چہ جمالے
خسرو شہ بہرام شہ آں شاہِ جواں بخت   کایام بنیا ورد چناں خوب خصالے
خود حکم تو کن، کیں بہ یا شعر عمادی   "کای بر سمن از مشک بعمدا زدہ خالے"

سید حسن غزنوی نے عمادی کی تقلید میں ایک قصیدہ بہرام شاہ کی مدح میں بھی لکھا تھا:

خاک را از باد بوے مہربانی آمدہ ست   در دہ آں آتش کہ آبِ زندگانی آمدہ ست
خسرو اعظم خداوند جہاں بہرام آنک   رسم او جاں بخشی و عالم ستانی آمدہ ست
گرم بکشادم فقاعے از سر خوانِ تنات   گرچہ شیریں نیست بارے نادرانی آمدہ ست

لیکن یہی قصیدہ سنائی کے یہاں (طہران سنہ ۱۳۲۰ شمسی ص ۹۰) سنجر کی مدح میں ہے، تیسرا شعر اسطرح ہے:

بر سر خوانِ عمادی من کشادم ایں فقع   "گرچہ شیریں نیست بارے نارواتی آمدہ ست"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری مصرع عمادی کے کسی قصیدے کا رہا ہو گا جو اب نہیں ملتا، سید حسن اور سنائی نے عمادی کے قصیدوں پر جو قصیدے لکھے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ عمادی کی شاعرانہ حیثیت کیا رہی ہوگی، اور غالب ہے کہ وہ اس سے عمر میں بھی بڑا رہا ہوگا، سنائی نے جوانی میں بلخ کا سفر کیا تھا کیونکہ کارنامۂ بلخ میں سلطان مسعود سوم ابن سلطان ابراہیم غزنوی (المتوفی ۵۰۸ھ) کی مدح ہے جس میں خود انکے والد کا ذکر آیا ہے (حکیم سنائی از خلیل اللہ خلیلی، کابل سنہ ۱۳۱۵ شمسی ص ۷۰) اس وقت عمادی غزنوی نے لکھا تھا،

چوں سنائی او فتاد از خطۂ غزنیں بہ بلخ   تازہ کرد از مدحتِ قاضی حسن رد سخن
چوں مرا از لشکرِ سلطاں بدلے بیوست بخت   بر در قاضی حسن دیدم معالی را وطن
اندراں فکرت کہ ایں قاضی چو آں قاضی بود   از عرق در آب آتش لِے دیدم خویشتن

آسماں گفت آفتابا با عمادی گو دشتر؟   خاک ایں قاضی حسن از خونِ آں قاضی حسن
ای دریغا روے آں بوسے کہ مدحش گفتمے   تا زمانہ فرق کردے شعر او از شعر من
گفتمے ای کلکلت آں مرغے کہ در پرواز او   آورد فرمانِ تو سیمرغ را بر باب زن
گفتمے ای کردہ [کلکلت] برخلافِ آسماں   مشتری را زہرہ سوز و زہرہ را برلطِ شکن

(مجموعۂ قصائد فارسی ۹۳ صفحہ ۲۷۰، حبیب گنج)

دوسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سنائی نے غزنیں سے بلخ کا سفر کیا تھا (یعنی ۵۰۸ھ سے پہلے) اسکے بعد عمادی نے رے کا سفر اختیار کیا، اور وہ "لشکرِ سلطان" میں بھی تھا اور غالباً اسی وقت سے اس نے رے کے ایک بلوک شہریار میں قیام کیا، اس قیام کی مدت معلوم نہیں لیکن اسی مقام سے وہ شاہ مازندان عماد الدولہ فرامرز شاہ کے دربار میں گیا تھا، چنانچہ ایک قصیدہ ہے:

نہ سیم و زر نہ یار و داریم   پس ما بہ جہاں چہ کار داریم
نزد ہمہ خلق چوں عمادی   در عاشقی اعتبار داریم
نومید ز شہریار شہریم   امید بہ شہریار داریم
سرمایۂ داد و دیں فرامرز   کز ہیبتِ او حصار داریم
تا بر درِ او قرار کردیم   بر چرخِ بریں قرار داریم
در لشکرِ او کمینہ مائیم   بنگر کہ چہ کار و بار داریم

تیسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عمادی شہریار شہر سے عماد الدولہ فرامرز کے دربار میں گیا تھا، اور آخری شعر سے واضح ہوتا ہے کہ وہاں کے لشکر میں داخل ہو گیا تھا، جیسا کہ وہ پہلے بھی سلطان مسعود سوم کے لشکر میں رہ چکا تھا، ایک اور قصیدے سے معلوم ہو گا کہ یہی شہریار میں رہنے والا عمادی اپنے وطن غزنین کو یاد کر رہا ہے:

اے مہرِ تو بر سپہر تمکیں   ایمن شدہ از نماز پیشیں

سرمایۂ جان عماد دولت	ملجاء ممالک سلاطین
آں کس کہ تافت ہمچو زنجیر	در حلقۂ مہرت از تف کین
گرد دو چشمش کشادہ بستہ	چوں چشمۂ قفل دو چشم زرفین
بستان حیات جاوداں را	از خط رضائے تست برچین
بے تو نہ بود کس و نہ باشد	مدحے نہ بود تمام تزئین
بے تو نہ کند ضمان تن جان	سرّ بیت دریں سخن بتضمین
زین است کہ از دلم جدا نیست	ہستی و بدن برائے غزنین
جستم ہمہ آرزو بتصریح	گفتم ہمہ رمزہا بتلقین
آں باد ترا کہ خواست داری	آمین ورا ست پیش از آمین

شعر نمبر ۸ سے شاعر کا غزنین سے گہرا تعلق واضح ہوتا ہے، اور اس سے پہلے کے قصیدے سے معلوم ہو چکا ہے کہ یہی شاعر شہریار سے اسی ممدوح کے دربار میں گیا تھا، اسلیے ظاہر ہوا کہ یہی عمادی غزنوی بھی ہے اور شہریاری بھی،

اب اس ممدوح کے متعلق معلوم کرنا ہے کہ وہ کون تھا؟ Rabino نے مازندان (ص ۱۲۵) میں لکھا ہے کہ شمس الملوک رستم بن قارن (سنہ ۵۳۶ھ تا ۵۶۰ھ) کا بیٹا سیف الدین عماد الدولہ فرامرز ہی عمادی کا مربی تھا، اور مرزا قزوینی نے (بیست مقالہ ج ۲ صفحہ ۲۷۲ - ۲۷۳) میں لکھا ہے کہ

"باحتمال بسیار قوی، مخدوم عمادی ہمیں شخص (فرامرز بن رستم) است .... ولیطور قطع و یقین معلوم نشد کہ آیا وے پسر ایں رستم بن قارن شہریار است یا پسر فخر الدولہ رستم بن شہریار ....."

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عمادی کا ممدوح فرامرز بن مرداویج بن وردان شاہ لنگرودی تھا، تاریخ طبرستان از بہاء الدین محمد بن حسن بن اسفندیار، (مرتبہ عباس اقبال طہران سنہ ۱۳۲۰ شمسی جلد دوم ص ۹۳) میں ہے کہ

"سید جمال الدین ابو القاسم علوی مامُطیری سنہ استرآباد بود، او و پدر او استرآباد بضمان داشتند، و عماد الدولہ مرداویج و فرامرز کہ ممدوح عمادی شاعر بودند، بادشاہ بودند، و قلعۂ بالمن ملک ایشان بود، بر رنج عمادی ہنوز

در آں قلعہ معمور است و آں را ہمی تواند شگافت، چوں مرداویج و فرامرز درگذشتند قلعہ با دغش افتاد و وردان شاہ و برادر او (علی یعنی پسران فرامرز) بخدمت علاء الدولہ علی بن شہریار بن نجم الدولہ قارن سنہ ۵۱۱ھ تا ۵۳۵ھ) شدند، ایں سید جمال الدین بخدمت وردان شاہ شد ......"

اس عبارت میں مرداویج کا لقب عماد الدولہ بتایا ہے، لیکن عمادی کے کلام میں یہ فرامرز کا لقب ہے، اور اس نے فرامرز ہی کی مدح لکھی تھی، اسی کتاب (صفحہ ۶۳-۶۴) میں ہے کہ اصفہبد (علاء الدولہ علی بن شہریار بن قارن) نے استرآباد کے قلعۂ بالمن کا محاصرہ کیا، اس میں فرامرز ابن مرداویج تھا، دو مہینہ کے بعد اس نے اصفہبد سے معافی مانگی اور اپنے بیٹے وردان شاہ کو بطور "نوا" اس کی خدمت میں بھیجا، اسی زمانے میں سلطان محمد بن ملک شاہ (المتوفی سنہ ۵۱۱ھ) کے بیٹوں نے اپنے چچا سنجر کے خلاف سر اٹھایا، سنجر ان کی سرکوبی کے لیے عراق روانہ ہوا اور اصفہبد کو مدد کے لیے بلوایا، ابھی اصفہبد روانہ نہیں ہوا تھا کہ اطلاع ملی کہ بھتیجوں نے ہے اگر معافی مانگ لی ہے، تاہم اسی کے بعد موسم سرما میں ایک بھتیجا مسعود بن محمد بن ملک شاہ (المتوفی سنہ ۵۴۷ھ/۱۱۵۲ء) اصفہبد کے پاس آکر ایک ماہ تک مہمان رہا، اور مال و سپاہ حاصل کر کے گرگان کی طرف سے واپس ہوا، وہاں فرامرز بن مرداویج نے باوجودیکہ اس کا بیٹا وردان شاہ اصفہبد کے حوالے تھا مسعود سے اصفہبد کی شکایت کی، مسعود نے فرامرز کو پکڑ کر سنجر کے پاس بھجوا دیا، اور "خواستند کہ اورا بپایان قلعہ آورند تا تسلیم کند فرمانِ حق یافت"، یعنی فرامرز کا انتقال سنہ ۵۳۰ھ/۱۱۳۶ء کے قریب ہوا ہوگا، کیونکہ ابن اسفندیار (مترجمہ براؤن صفحہ ۵۹) میں ہے کہ خلیفہ المسترشد کے قتل (۵۲۹ھ/۱۱۳۵ء) کے بعد سلطان مسعود پہلی بار اصفہبد کے یہاں آیا تھا، فرامرز کی مدح میں متعدد قصیدے ہیں، ایک قصیدے سے معلوم ہوتا ہے کہ فرامرز پہلے بھی

کسی پریشانی میں مبتلا ہو کر (شعر ۵-۶) خراسان میں رہ چکا تھا:

اے کافرِ عشق تو مسلمان   دے دیو ہوائے تو سلیمان

طاق است بعشق تو مجازی   بر طاق نہادہ وصل و ہجران

ہرچند مستے تو اورا   در دولتِ شہریار ایران

قطبِ ملکان عمادِ دولت   سرمایۂ امن و پشتِ ایمان

عید است شہا و عید پاریں   رخ داشت ازیں دیار پنہان

ممکن نہ بود بہ ہیچ حالے   عید ایں جا تو در خراسان

عیدِ تو خجستہ باد ہرچند   برمن باشد ز عقل تاوان

زیرا کہ ہر آنچہ گفتم اول   زیں قول ہمی شود پشیمان

ہرچند ز بودن سہ فرزند   نتواں گفتن بہ وصف یزدان

سود یست زمایہ در گذشتن   ایں را عدم از وجود ایشان

سبحان اللہ شد از تمامی   کار تو چنانکہ وصف نتواں

در نعمت تو نکو نہ باشد   خوردن غم خاندان ویراں

آخری اشعار میں عمادی نے اپنے تین بیٹوں کا ذکر بھی کیا ہے، ایک قصیدہ ایسا ہے جس کے تمہیدی اشعار سنائی کے یہاں بھی ہیں (دیوان سنائی صفحہ ۱۱، بمبئی ۱۳۲۸ھ) اور سلطان بہرام شاہ غزنوی (المتوفی ۵۵۲ھ) کی مدح میں ہیں، اور وہی اشعار عمادی کے قصیدے میں بھی ہیں، اور وہ اسی عماد الدولہ فرامرز کی مدح میں ہیں:

گر درخت صف زدہ ست لشکر دیو و پری   ملک سلیمان تراست گم مکن انگشتری

شاہ فرامرز را دولت و دیں را عماد   خسرو مازندراں سایۂ نیک اختری

ایک اچھا قصیدہ اس طرح ہے:

ترا چنانکہ توئی دیدہ در نمی یابد   بصر ز نور تو بر تو ظفر نمی یابد[1]

عمادی از پئے جنگ سپاہ ہجرانت   ز خون دیدہ قوی تر حشر نمی یابد

عماد دولتِ عالی کہ چشم دولت و دیں   برون ز بار گر او بصر نمی یابد

ایک قصیدہ ہے:

دلے کہ بستۂ بندِ بلا تواند بود   ز آب و آتش و خاک و ہوا تواند بود

عماد دولتِ عالی کہ گردِ موکبِ او   برائے دیدۂ جاں توتیا تواند بود

اسی قصیدہ میں بعض اشارات ہیں:

خدایگا ناخصمانِ تو بداں بودند   کہ کین تو ز سعادت عطا تواند بود

نبود شان خبر آں کہ ہر یکے زیشاں   بدام کردۂ خود مبتلا تواند بود

مازندرانی حکمرانوں کی طرح یہ ممدوح بھی امامیہ عقائد کا رہا ہوگا،

در آفتاب قیامت نسوخت کس زیرا   بسایۂ علم مرتضیٰؓ تواند بود

ایک قصیدہ میں ہے:

اے بہ رخ ہمچو گل، مایۂ شمس و قمر   وے بہ لب ہمچو مل، گوہر شہد و شکر

شاہ عمادِ دول، کز کف و از طبع او ست   نخل سخا را رطب، باغ خرد را شجر

شمسۂ روے علم پشت سپاہ ترا   ہدیہ کند ہر نفس شعلۂ نو ظفر

بعض قصیدوں میں یہ القاب آتے ہیں:

قطب الملوک شاہ عماد دول کہ چرخ   ہر ساعتے ز قدرت او امتحاں برد

شاہ سیف الدین عماد الدولہ کز تعظیم او   از کفِ خود ہر چہ خواہد رایگاں می افگند

---

[1] لباب الالباب (ج ۱، ص ۹۹) میں ہے کہ عمادی کے جواب میں یوسف بن ناصر الکاتب نے خسرو ملک غزنوی کی مدح میں قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع یہ ہے:- دہان تنگ ترا وہم در نمی یابد   بعید فسون سخن زو گذر نمی یابد

ایک قصیدہ کے آخری اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر نے ممدوح کے کسی مہمان کی وجہ سے (غالباً قدر ناشناسی کی وجہ سے) اپنی خودی کو ٹھیس لگنے سے بچایا تھا:

اے نرگسِ تو طبیبِ بیمار — وے لالۂ تو امین و طرار
قطب ملکاں عماد دولت — کز درگہ اوست لائقِ ابرار
شاہے کہ بود بہ باغِ ملکش — ہموار ترنج عدل پُر بار
روزے کہ بہ تو بود مہمان — بودم ز حدیث شعر بزار
زاں بیم کہ نبایدم گفت — در اثنائے ثنا، تو بسیار
عذرم بپذیر اگر بمانم — در شیوۂ مدح تو ز رفتار
زیراک اندر نوائے مدحت — برداشت بود بسے فرو دار

ایک قصیدہ اسی عماد الدولہ کے بیٹے شمس الدولہ (؟) کی مدح میں بھی ہے:-

ہر کہ اعشقت اختیار کند — بے قراری برو قرار کند
شاہ شمس عماد دین و دول — کہ بدو عالم افتخار کند
ملکے، خسروے، خداوندے — کہ کفش طعنہ بر بحار کند
عید را مہرگاں بمیداں تاخت — تا ز درگاہ تو در آر کند
تا کہ سعی تو بعید رضا — مہرگاں را امید وار کند

آخری اشعار میں اگر عید اور مہرگان استعارہ نہیں بلکہ حقیقت ہے تو ممکن ہے کہ وہ ۵۵۲ھ/۱۱۲۸ء کا زمانہ ہو، تاہم اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عمادی اپنے ممدوح عماد الدولہ فرامرز کے انتقال کے وقت (۵۳۰ھ/۱۱۳۶ء) قلعہ بالمن (استرآباد) میں نہ ہوگا، بلکہ طغرل بن محمد بن ملک شاہ (المتوفی ۵۲۹ھ/۱۱۳۴ء) کے دربار میں ۵۲۷ھ/۱۱۳۲ء سے پہلے پہنچ چکا تھا، کیونکہ اس کے وزیر قوام الدین

ابو القاسم درگزینی (المتوفی ۵۲۷ھ/۱۱۳۲ء) اور اس کے بیٹے جلال الدین کی مدح میں قصیدے لکھے تھے، پھر عماد الدولہ فرامرز کے انتقال پر عمادی نے ایک رباعی مرثیے میں لکھی تھی:

اکنوں کہ عماد دولہ در خاک آسود — از دیدۂ من خاک شد و خوں آلود
در خاک نہادہ چوں توانم دیدن — آں را کہ مرا ز خاک برداشتہ بود

ایک مرثیہ چھوٹی بحر میں بھی ہے، اور بہت پردرد ہے:-

در غم یار یار بایستے — یا غمم را کنار بایستے
بر درِ دوست بار ممکن نیست — بر در صبر بار بایستے
مست و دیوانہ چند خواہم بود — زیرک و ہوشیار بایستے
ایں کہ من شرمسارم از مردم — سخت من شرمسار بایستے
از فریبِ جہاں عمادی را — نفسے زینہار بایستے
ایں ہمہ آرزو بیافتمے — حضرتِ شہریار بایستے
شہ فرامرز کز معالی او — اختراں را شمار بایستے
چوں مدارا نکرد با او مرگ — آسماں بے مدار بایستے

سلطان طغرل بن محمد بن ملک شاہ (المتوفی ۵۲۹ھ/۱۱۳۴ء) اور عمادی کے تعلق کے متعلق راحت الصدور (ص ۲۱۰) میں ہے کہ "امیر عمادی اگرچہ بمالک مازندران اختصاصے داشت ولقب او از عماد الدولہ فرامرز شاہ مازندران مبنی است عظمت از شاعری حضرت سلطان (طغرل) یافت"، پھر عمادی کے دو قصیدے طغرل کی مدح میں ہیں:

(۱) کار خرد ساختہ ست کام ہنر حاصل است — ہیچ بہانہ نماند شاہ جہاں طغرل است
خسرو کسریٰ غلام داند کز شرق و غرب — بندہ عمادی بشعر خوب ترین قایل است

(۳۱) اے زلف و رخت سپہر و اختر
وے، روے ولبت بہشت و کوثر

سلطانِ سپہر قدر، طغرل
کز قبۂ دانش ست برتر

بر ہم کو بند گرد گیراں
مانند جبال روز محشر

از دو دچناں شود کہ گوئی
شیر علم ست شیر محمر

لباب الالباب (ج ۲۔ ص ۲۶۴ بعد) میں ایک قصیدہ ہے، جس میں اتابک قراسنقر (شعر ۲) "امیرباد" (قتلغ، شعر ۴) وغیرہ کا ذکر بھی آیا ہے:۔

شاہ بہشت مجلس طغرل کہ روز رزم
از نعل پارہ گنبد کوکب حشر شکست

بے شبہتے سنانِ قراسنقر سترگ
آں روز بند چرخ حوادث شم شکست

در باغ عمر دشمن شاہ جہاں طراز
تیز از نوک نیزہ نہیبت شجر شکست

عجز شکستہ بند طبیعت درست شد
آں گہ کہ میربار صف آں نفر شکست

آوازۂ رسید بپایۂ بر آسماں
بازار آق سنقر آشوب خر شکست

ایشان بتیر و نیزہ شکستند بہر آنک
صدرِ جہاں بخامہ از آں بیشتر شکست

ایک قصیدہ میں "امیرباد" عزالدین قتلغ کی مدح ہے (جس کا ذکر تاریخ میں نہیں آتا) جس کی وجہ سے عمادی طغرل کے دربار میں پہنچا تھا، اور اس کا لقب سلطانی ہو گیا تھا:

دست درہم نمی کند کارم
پاے مردی نمی کند یارم

لقبم دادہ اند سلطانی
چوں عمادی چرا چنیں خوارم

ہمہ علیم جز آنکہ دُرِّ ثنا
بر سر میربار می بارم

عزِّ دینِ خداے قتلغ آں
کز انعام او گراں بارم

از تو سلطاں ثنا ختم گر:
من و سلطاں کجا سزاوارم

دخورم غم، چرا خورم کہ توئی
از پے ہر مراد غم خوارم

عمادی نے سلطانی ہونے کا ذکر سلطان طغرل کی مدح میں بھی کیا ہے،

دلم از دست بردہ جانی
چہ کنم با تو دوستی جانی[1]

خونِ خود خوردم و بخواہم خورد
از پے وصلِ تو پشیمانی

جاوداں ماں کہ فرعشقِ تو بود
کہ عمادی شدہ ست سلطانی

آستیں بوس تو شود گردوں
آستاں بوس شاہ ایرانی

شاہ طغرل کہ پیش گاہ ازل
آیتے ساختش جہاں بانی

زاں نشستی بتخت جد و پدر
تا در آفاق فتنہ بنشانی

ثالثت گفتم ارچہ نتواند
گفتن اندر ثنا ترا ثانی

آخری شعر میں ممدوح کو تیسرا بادشاہ کہا ہے، یعنی طغرل بن محمد بن ملک شاہ، ایک قصیدے میں طغرل کے وزیر قوام الدین ابوالقاسم (المتوفی ۵۲۷ھ / ۱۱۳۲ء) کی مدح ہے:۔

چشمے کہ ز تو نگار گیرد
در خونِ جگر قرار گیرد

وقت ست کہ در غمت عمادی
جان و دل و دیدہ خوار گیرد

بوالقاسم آں کہ از درِ داد
انصاف بنام کار گیرد

گویند کہ از گسستن عمر
مردم ز جہاں کنار گیرد

با عمرِ تو ہر کہ ایں سخن گفت
لب خاید و اعتذار گیرد

آخری دو شعروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ قوام الدین ابوالقاسم اس وقت تک بوڑھا ہو چکا تھا، اس کی مدح میں یہ شعر بھی عمادی نے کہے تھے:

[1] ۵۴۵ھ کے قریب سید حسن غزنوی اور انوری نے مجدالدین ابوالحسن عمرانی کی مدح میں بھی یہی زمین اختیار کی تھی:

اے کرتن را دل و دل را جانی
وز دل و جان بہ نکوتر آنی (سید حسن)

دلم لے دوست تو داری دانی
جاں ببر نیز اگر بتوانی (انوری)

گردون تو می فرازی چون خوانمت سحاب — سلطان تو می نشانی چون گویمت وزیر
از مهر توستاند واز کین تو دهد — ابروے شام وسمہ و پستانِ صبح شیر
(آثار الوزراء ق ۱۸۳-۲ - بانکی پور)

قوام الدین کے بیٹے جلال الدین ابوالفضل کی مدح میں بھی ایک قصیدہ ہے، جس میں شاعر کی پشت خمیدہ (شعر ۲) اور ممدوح کی کم عمری (شعر ۰) کا ذکر ہے،

دل و جانم بعشق تو سمرند — همه عالم بدین حدیث درند
پشت من گشت حلقۂ در تو — جاں فروشند و عشوۂ تو خرند
عشق بازاں روے تو بہ نیاز — مدح سازانِ عہد و داد گرند
مقصدِ آسمان جلال الدین — کہ زدو دستش زجود بارورند
خواجگانِ جہاں غلام تواند — گرچہ از تو بسال بیشترند

سلطان طغرل کے عہد کے ابو منصور المظفر بن ابوالحسن بن اردشیر بن ابو المنصور العبادی الواعظ المروزی (المتوفی ۵۴۷ھ) کی مدح اور عمادی کے بہرہ مند ہونے کا واقعہ راحت الصدور (صفحہ ۲۰۹) میں ہے، اس کی مدح کے دو قصیدے ملتے ہیں:

(۱) رہ می روم و دیدہ بہ رہبر نمی رسد — کان می کنیم و تیشہ بہ گوہر نمی رسد
بر پایۂ سریر تو چرخ ار نداد بوس — عذرش قبول کن کہ مگر بر نمی رسد
تعبیر رمز عشق میاموز عقل را — از بہر آنکہ یک کلمہ در نمی رسد
شوق شراب عشق تو در ہر سحرگہے — الا بکام مغز کشودہ نمی رسد
رنگ و رنگ گوہر عبادی آنکہ زاد — صد خیر می رسد کہ یکے شر نمی رسد

(۲) قد قامت القیامہ کجا عشق داد بار — بل عشق صعب تر ز قیامت ہزار بار

از خیط ما عبادی اگر خیط بایدت — شو دست زن بدامنِ عبادی استوار
شاہ جلال را نکتۂ وعظ او سریر — زر جمال را سخنِ عذب او عیار
دوران اسم او شود اسلام را جمال — بارانِ اسم او دہد ایام را بہار
یارب توئی گواہ عمادی درین سخن — سرمایۂ رضاے تو کردہ ست خواستار
گر عمر مختصر شودش باک نیست ہیچ — محجوب دار ہمتِ او را ز اختصار

آخری شعر میں بھی عمادی نے اپنے بڑھاپے کے متعلق اشارہ کیا ہے،

ان کے علاوہ عمادی کے چند ممدوح اور بھی تھے، ابن اسفندیار (مترجمہ براؤن ص ۵۹) میں ہے کہ اتابک عبد الرحمٰن بن طغایرک نے اردبیل سے علاء الدولہ علی بن شہریار بن قارن (المتوفی ۵۳۵ھ) کے دربار میں آکر مدد چاہی تھی اور یہ کہ عمادی اس کا مدح نگار تھا عمادی نے ایک قصیدے میں اسے "شہ مظفر" کہا ہے:

چوں نوبتِ حسن تو در آمد — فریاد ز عاشقاں بر آمد
درویش کنار و بوسہ باشد — آن کس کہ زغم تو انگر آمد
اندیشۂ تو مرا مبارک — چوں عید شہ مظفر آمد
عبد الرحمٰن کہ آفرینش — باہمت او محقر آمد

یہ عبد الرحمٰن بعد میں سلطان مسعود بن محمد ملک شاہ (المتوفی ۵۴۷ھ/۱۱۵۲ء) کا حاجب (راحت الصدور صفحہ ۲۲۵) ہوگیا تھا، ایک ترکیب بند میں آٹھ آٹھ اشعار کے آٹھ بند ہیں، ان میں سے چند اچھے اشعار یہ ہیں:

بند نمبر ۱
گفتی بہ چہ ماندۂ درین غم — خود مشکل من ہمیں سوال ست
دولت یارے چو تو نہ دیدم — کز روے تو شاہ بے ملال ست

فخر الدین کز بزرگواری   تن در نہ دہد بہ تاج داری

بند نمبر ۲   گر پند ترا دہد عمادی   نمکیں مکنش کہ زاژ خائیست

عبد الرحمٰن کہ گر بخواہد   از ہفت سپہر شش بکاہد

" نمبر ۵   گرد افشاندے ز روئے نصرت   تائید بہ پرچم سیاہش

" نمبر ۶   عبد الرحمٰن کہ نوک پیکان   بر دیدۂ مشتری نگارد

" نمبر ۸   چوں در شعرا امیر باشی   بر شارعِ شرع باد گامت

اقبال چو سکۂ نگارد   مشہور مباد جز بنامت

ان چیدہ چیدہ اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ عبد الرحمٰن کا لقب فخر الدین (شعر نمبر ۳) تھا، یہی لقب زبدۃ النصرہ (اختصار البنداری طبع ہوتسما، لیدن ۱۸۸۹ء، صفحہ ۱۹۲) میں ہے اور یہ کہ ۵۴۱ھ میں اس نے وفات پائی، اشعار نمبر ۲ اور ۶ سے ظاہر ہے کہ وہ سلجوقی شاہ (یعنی مسعود بن محمد بن ملک شاہ) کا تربیت یافتہ تھا، اور شعر ۸ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ممدوح اگر "امیر شعرا" نہیں تو کم از کم شاعری سے ذوق رکھتا تھا، ایک قصیدے میں اس کے فخر الدین ہونے[1] کا ذکر ہے:

رایگاں رخ نمی نماید یار   بہ سخن راست می نہ گردد کار

گر لب اوست نیست در بہ بست   سم اسپ خدایگان کبار

تخت بخش زمانہ فخر الدین   کز حوالی او گریزد عار

کوئی ممدوح امیر عز الدولہ عبد الواحد تھا:

کاریست مراد نیست یارے   بے یار کرا گرفت کارے

[1] راحت الصدور (ص ۲۳۰) میں عبد الرحمٰن کے بیٹے کا نام فخر الدین لکھا ہے،

از بہر پناہ می نیاید   جز عز الدولہ شہریارے

عبد الواحد کہ گوش گردوں   نشنید چنو زمانہ دارے

در سابقہ خدمتے نہ دارم   کاں راست مجال اعتبارے

ایک ممدوح امیر عبد الجلیل تھا،

اے خرد از خدمت تو نیک کام   وی ہنر از دولت تو شاد کام

نام تو اندر دلِ خورشید نقش   کام ترا بر سر گیتی لگام

راد ہمایوں کفِ عبد الجلیل   نسختِ اقبال زمین تا بہ لام[1]

ایک ممدوح محمود بزغش[2] تھا:

قسیمِ درم راد محمود بزغش   کہ بر چرخ رایش کند برباوی؟

ایک عبد الصمد بھی تھا:-

اے دستِ تو جود را بہانہ   پاے تو وجود را نشانہ

عبد الصمد اکرم الخلایق   سرمایۂ بختِ جاودانہ

سید حسن غزنوی کا بھی ایک ممدوح عبد الصمد ہے، جو ممکن ہے کہ یہی ہو،

گر نتیجۂ بحر است بر خلافِ قیاس   نتیجہ آمد بحرے ز گوہر عباس[3]

ابو المحاسن عبد الصمد کہ بخت ابد   بناے دولتِ او را بہ رے نہادہ اساس

ایک دوسرے معاصر عبد الواسع جبلی (م ۵۵۵ھ) کا بھی ممدوح یہی ہوگا۔

[1] بحر سریع مسدس مطوی موقوف کا یہ قدیم نمونہ ہے۔ [2] ایک بزغش کا ذکر تاریخ سیستان (ص ۳۸۹) میں ہے جو سنجر کا سپہ سالار تھا، اور ۴۹۷ھ میں سیستان آیا تھا، دیکھیں ابن الاثیر ج ۱۰ ص ۱۱۲-۱۱۳

[3] دیوان سید حسن غزنوی، طہران ۱۳۲۸ شمسی صفحہ ۱۰۰

عبد الصمد عزیز ملوک و نصیر دین   کز عقل ہست عاقلۂ نسلِ بو البشر
نور و سرور چشم و دل حمزہؓ و علیؓ   آں مایۂ بزرگی و پیرایۂ ہنر[۱]

عمادی کے چند ممدوح اور ہیں جن کے متعلق معلومات نہیں ہیں :-

چوں نسب گوئی امیر ابن الامیر   چوں لقب جوئی مجیر ابن الظہیر
عنصر دولت محمد شرف الدین   کز کفِ او حاصل بحار بر آمد
مہدی خرد محمد نعمان کہ از ہنر   بر سیرتِ محمد مختار می رود[۲]
زق فرقد امام قطب الدین   ہمگی دین کدام قطب الدین
ناصر الدین پہلوان سخن   پہلوان و خدایگان سخن
آں شب کہ مراد سید جعفر   کاہی بے خبر از مقام خود تم[۳]

اب کچھ ایسے کلام پر بحث کرنے کی ضرورت ہے جس کی وجہ سے عمادی کے زمانے کی تعیین میں شبہات پیدا ہوئے ہیں، ڈاکٹر ریو (Rieu) نے (فہرست برٹش میوزیم جلد دوم، صفحہ ۵۵۸) خیال کیا ہے کہ عمادی کا ایک قصیدہ "جہاں پہلوان" یعنی اتابک محمد بن ایلدگز (المتوفی ۵۸۲ھ) کی مدح میں ہے۔

گنبد مشکیں شدہ ست چرخ ز بوے بہار   غالیہ پیوند گشت باد چو گیسوے یار ....
گرد رخ شنبلید داشت نسیم بہشت   گفتم کیں چیست، گفت خاکِ در شہریار
خسرو گردوں کمند شاہ جہان پہلوان   آں کہ کند کوہ را ہیبت او اشکبار

۱؎ قصائد عبد الواسع جبلی، حبیب گنج، مخطوطہ نمبر ۴۹ ۲؎ سید حسن غزنوی (ایضاً صفحہ ۵۸) نے بھی یہ زمین اختیار کی تھی: چشم چو بہ سرگل و گل زاری رود   اندیشہ در پئے دل و دلدار می رود

۳؎ اسی زمین میں فلکی شروانی (از ڈاکٹر ہادی حسن، لندن ۱۹۲۹ء، صفحہ ۸۲) کے اشعار بھی ہیں،

چاشتگہے کز خروش خاک بجوشد چو آب   از علم زنگ رنگ باد نماید چو نار ...
بر در تو می رود عمر عمادی خوش ست   گر چہ یقین داند عمر نباشد دو بار ...

(لباب الالباب، ج ۲ ص ۲۵۷ ببعد)

لیکن "شاہ جہاں پہلوان" (شعر نمبر ۳) سے اتابک محمد پہلوان مراد لینا صحیح نہیں، بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ یہ قصیدہ کسی سلجوقی سلطان (یعنی طغرل بن محمد بن ملک شاہ جہاں؟) کی مدح میں ہو، کیونکہ "علم زنگ رنگ" (شعر ۴) دراصل سلجوقیوں (اور غزنویوں) کا علم تھا، اور اتابک محمد پہلوان کا علم سرخ تھا، جیسا کہ مجیر بیلقانی نے کہا ہے:

رایتِ سرخ ترا کافسر فتح و ظفر ست   مایۂ نصرت و پیرایۂ لشکر گیرند

(راحۃ الصدور صفحہ ۳۱۸)

ایک قصیدہ ملک طغان کی مدح میں بھی ہے جس کو ریو (ایضاً) نے طغان شاہ ابن مؤید آبہ (۵۶۹ھ تا ۵۸۱ھ) سمجھ لیا ہے، وہ قصیدہ یہ ہے :-

زاں گہ کہ در تصرف ایں سبز گلشنم   در کام اژدہاے نیاز است مسکنم
باز سپید دانشم و در ہمہ جہاں   جز آستانِ شاہ نباشد نشیمنم
خسرو ملک طغان کہ ز بس لطف شاملش   از منت عطاے وے آسودہ شد تنم

میرا خیال ہے کہ یہ طغان شاہ ابن مؤید آبہ نہیں بلکہ ملک طغان بن الپ ارسلان ہے، کیونکہ اسی کے بھائی ملک ارغون بن الپ ارسلان (المتوفی ۴۸۹ھ) کی مدح میں بھی عمادی کا یہ قصیدہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں،

شاہ ہمہ شاہان ملک ارغون کہ ندارد   در مردمی و فرہنگ نظیرے و ہمالے

سید حسن غزنوی جس نے عمادی کی کئی زمینوں کو اختیار کیا ہے، مذکورۂ بالا زمین میں بھی کہتا ہے:

جان می برد بعشرت حوران گلشنم   تن می کشد بخدمت دیوان گلخنم

ترسم ز ننگ صحبت زاغ سیاہ تن | باز سپید جان بپرد زین نشیمن
از بعد پانصد و چہل و پنج گو بیا | در من نگر کہ معجزہ جدّ خودمنم

سید حسن غزنوی نے "باز سپید" کی ترکیب بھی عمادی کے مذکورۂ بالا شعر نمبر ۲ سے لی ہوگی (لباب الالباب ج ۲ ص ۱۹۱۱)

میں بھی مجد الدین بن عدنان اور سعد الدین اسعد بن شہاب کے اشعار بھی اسی زمین میں ہیں۔ اسی ملک ارغون اور ملک طغان کے بھائی الب غازی بن الپ ارسلان کی مدح میں عمادی کے یہ اشعار ہونگے،

تا چند ز صحبت مجازی | تا کے سخنان نا نمازی[1]
خود قول بود بدیں دروغے | خود عشوہ بود بدیں درازی
اکنوں بارے شکر فراخ ست | یعنی لب لعل الب غازی

(مجمع الفصحاء ...)

عمادی کے انتقال کے متعلق ابوالعلاء گنجوی کے یہ اشعار اہم ہیں:

سخن وراں بہ من امروز اقتدا آرند | روا بود کہ منم قدوۂ ہمہ شعرا
چو رفت جان عمادی بمن گذاشت عماد | چو شد روان سنائی بمن گذاشت سنا
تبارک اللہ پنجاہ و پنج بشمردم | گہ وداع رحیل ست ازیں فناء فنا
سر ملوک منوچہر مہر چہر کزو | شدہ ست زندہ و فرخندہ خاندان بنا

(مجمع الفصحاء ...)

گویا منوچہر (المتوفی ۵۵۵ھ، Manuel de Genealogie by Zambour صفحہ ۱۸۲) کے زمانے میں جبکہ ابوالعلاء گنجوی کی عمر ۵۵ سال سے گذر کر چھٹی دہائی (شعر ۳، ۴) میں تھی، اُسوقت عمادی اور سنائی (شعر ۲) نے انتقال کیا تھا، خانیکوف (Khanikof) تذکرۂ خاقانی (اورنٹیل کالج میگزین، اگست ۱۹۳۶ء صفحہ ۵۲) میں ابوالعلاء گنجوی کی مفروضہ پیدائش ۴۸۵ھ اور ۴۹۰ھ کے درمیان بتائی ہے، اس حساب سے وہ اشعار اس شاعر کی ۵۵ سالہ عمر کے بعد یعنی ۵۴۰ھ یا ۵۴۵ھ کے بعد لکھے گئے، اور سنائی کا سال وفات ۵۴۵ھ ارجح قرار دیا جاتا ہے، اسلئے ظاہر ہے کہ ۵۴۵ھ تک عمادی بھی وفات پاچکا تھا،

---

[1] تاریخ بیہقی ... ملک الشعراء بہار، طہران ... صفحہ ۳۸۸ میں الب غازی کا ذکر یوں آتا ہے: "آمدن (در سیستان) امیر الب غازی بر ورق چہار دہم ... ۴۹۰ھ ..."

ہندوستانی زبان کا ایک قدیم مرثیہ

جناب شیخ فرید صاحب لیکچرار، رابرٹسن کالج جبلپور

حضرت مسیح الاولیاء ——— شاہ عیسیٰ جند اللہ[1] ——— دسویں صدی ہجری کے جید عالم، فاضل متبحر، صوفی صافی بزرگ اور کئی تصانیف کے مالک تھے، ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء[2] میں اس سرائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کی، ایک عقیدت کیش مرید نے ہندوی زبان میں ان کا مرثیہ لکھا جو تاریخ اردو کی ایک اہم کڑی ہے، اس لیے اس کو مختصر تبصرہ کیساتھ پیش کیا جاتا ہے،

تلاش کے باوجود مصنّف کے نام اور حالات کا پتہ نہ چل سکا، اور نہ مرثیہ کی تصنیف کی کوئی متعین تاریخ معلوم ہوسکی، مگر اس قدر یقینی ہے کہ وفات کے قریب ترین زمانہ میں کہا گیا ہوگا، اس اعتبار سے اس کا زمانۂ تصنیف گیارہویں صدی سنہ ۱۰۳۱ھ کے قریب ہوگا،

اس مرثیہ کا ایک نادر اور خوش خط مخطوطہ کتب خانہ درگاہ راز الٰہی (برہانپور) میں محفوظ ہے، اس کے سجادہ نشین اور متولی حضرت سید اکرام الدین صاحب اور حضرت سید حبیب الدین صاحب کی مہربانی سے یہ نایاب مخطوطہ مجھے مطالعہ کے لیے مل گیا، جس کے لیے میں انکا شکر گذار ہوں، زیر نظر مخطوطہ میں کل ۴۴ بند ہیں، ہر بند عموماً پانچ اشعار اور ایک دوہرہ پر مشتمل ہے،

---

[1] تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ کیجئے راقم السطور کا مضمون (شاہ عیسیٰ) معارف ستمبر ۱۹۵۲ء

[2] تاریخ وفات ۱۵ شوال ۱۰۳۱ھ مطابق منگل ۱۳ اگست ۱۶۲۲ء،

آٹھ اشعار نا مکمل ہیں، کیوں کہ بعض جگہ عبارت کرم خوردہ ہے، کسی بند میں ایک دو شعر کم یا زیادہ ہیں، اور کسی کے آخر میں ایک دوہرہ زیادہ ہے، اس طرح اشعار کی کل تعداد ۴۴۲ اور دوہروں کی ۴۹ ہے،

عنوانات فارسی میں سرخ روشنائی سے اور مطالب اور دوہرے ہندی زبان میں سیاہ روشنائی سے مرقوم ہیں،

حضرت شاہ عیسیٰ کی منقبت اور حضرت شیخ محمد عارف کے عرس کی تفصیلات سے لیکر حضرت کی اس دنیا سے رحلت، بہشت کی آرایش، حضرت محمد غوث اور شاہ لشکر کے روحوں کی آمد، فرید (مرید) کو اس "وقتِ آخر" کی اطلاع، حضرت کا انتقال، تجہیز و تکفین، خانقاہ میں ماتم، تدفین، اطراف و جوانب میں ماتم، مصنف کا سوز و گداز، حضرت کی روح کا جنت میں داخلہ اور ارواحِ انبیاء کی جانب سے استقبال، دیدار الٰہی سے شرف یابی تک کی تمام تفصیلات منظوم ہیں،

اس مرثیہ کی اردوے قدیم سے قرابت، پنجابی اور راجستھانی زبانوں سے اس کے تعلقات اور اثر پذیری کے لحاظ سے اردو کی تاریخ میں اس مرثیہ کی اہم حیثیت ہے، اور ابتک وہ عام نظروں سے پوشیدہ رہا ہے، اس لیے اس کا تعارف ضروری ہے،

(۱) اس میں اسماء کا املا عجیب طریقہ سے لکھا گیا ہے، مثلاً

عیسیٰ کو عیسن، آگرہ کو آگرے، برہانپور کو برنپر اور برہانپر اور دکھن کو دکھم۔

عیسن شاہ مہا گر گیانے   جا کے کت کنوں نہیں جانے

حکم کیا ہر سرگ بنا دو   برنپر۔ اک ٹھور ملا دو

جگ بھیو سب جن کو چیرو   برہانپر تن کیو بسیرو

کشمیر اور دلی آگرے   جگت گرد کوں رو نگرے

ہندی اسماء کا استعمال بڑا لطیف ہے:-

ہرا ہن (گم کردہ راہ) ابرہی، پرپی، مٹھ بولا (شیریں بیان)، من ماتا (دلپسند) للکن (خرام)، لٹک (ادا)، چت چور (ہوش ربا)، برن (ذکر)، بچھڑت وغیرہ،

(۲) جو الفاظ ہ پر ختم ہوتے ہیں، ان کو الف سے لکھا ہے، جیسے

مرثیہ کو مرثیا، پیالہ کو پیالا، سندیہ کو سندیسا،

مورکھ لوگ کٹھن بھیو ہیا   معراج نکہیں کہیں مرثیا

سب مرہیں کسو نہیں جیونا   یہ پیالا سب کا ہو پینا

شاہنشاہ چلے تن دیا   چت سہو ہی جاکے سندیسا

کہیں الفاظ کے آخر میں الف بڑھا دیا ہے، جیسے

دیس کو دیسا۔ قندھار کو قندھارا۔ بات کو باتا،

ملتان، کابل قندھارا   شیخو پور اور پٹن سارا

ع کیا کوئی جانے گر کی باتا

بات کو ایک جگہ بتے بھی لکھا ہے

اک بتے سنو ہماری   تم دیے چلے دوکھ بھاری

بات کی جمع باتاں اور بتیاں دونوں لکھی ہیں،

ع کب تک بتیاں اور کہانے

ع سن برہی برہ کا باتاں

(۳) (ی) یاے معروف پر ختم ہونے والے الفاظ کو ہ اور ؤ کے اضافت بھی لکھا ہے، مثلاً

پی کو پیہ، پیو۔ جی کو جیہ، جیو

ع۔ پیہ کارن ہیہ او مکیو جائے ع۔ اک پیو بچھڑت بھئے دوانے

ع۔ جی بتیاں کرکے من مانے ع۔ او میرے جیہ کے پیارے

تون تو جیو جیو کو ہے پیارو کن دیکھوں تن جیہ تین نیارو

ع۔ جیہ تین پران ہمارے جبورے

کہیں کہیں ایک ہی بند میں املا کی مختلف شکلیں ہیں، جو اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ اس زمانہ میں تحریر کی "رسم کہن" اور "آئینِ نو" دونوں جاری تھے،

(۵) کہیں "ضرورت شعری" نے دلچسپ صوتی تبدیلیاں بھی پیدا کردی ہیں، مثلاً شامیانے کو شمیانے۔ مخمل کو کھمل۔ خانقاہ کو خانقہ، کھان گاہ، لہو کو لوہو۔ حضور کو ہجور۔ گرو کو گر، گور

(۶) الفاظ کے املا میں ہندی کا اثر غالب ہے، یعنی ل کے بجائے ر استعمال کیا گیا ہو مثلاً چیلا = چیرو، چیرا۔ گلے = گرے۔ جلادیں = جراویں۔ کالی = کاری۔

جگ بھیو سب جن کے چیرو بر ہانیر تن کیو بسیرو

کھان گاہ ان کی ات سوہے جن سب جگ کے پرمی موہے

نبی ولی سب اگون آئے آدم لے کر گرے لگائے

ع دھواں لبان اور اگر جراویں

یا ع گھر سے نکسے عسن پیارے

(۷) ضمائر کی اشکال یہ ہیں،

کون، کوئی، اس، جن کو، ان کو، تجھ کو، وہ، اس کے، ہمیں، جائے،

کو، کنوں، ان، تن کو، ان کوں، تو، واہ، واکے، ہمے، جس کے
ہمیں ہم توکو

(۸) حروف اس شکل میں تحریر ہیں:

(الف) حروف ظرف میں = مانہی، ماہیں، مانہ، تن

(ب) حروف جار سے = تیں، سین، سیون

(س) آگے = آگوں، آگیں

(س) حروف نفی نہ = نان، نہ، ناہیں، نکو

( ) صلہ فعل بہت ات

ایسا ایسو

جیسا جن سا

(۹) افعال :- آیو، لگایو، کہیو، کیو، لیاؤو، جرایو، رہیو، پہنچیو، ایایو، گنوایو، نکسو، گیو، بنایو، بہایو، پایو، وغیرہ

افعال میں حرف آخر (الف) کے بجائے واؤ ہے،

کچھ افعال کے آخر کا نونّ (ن) نے کا مفہوم ادا کرتا ہے، مثلاً

گاون، لیون، دیکھن، روون، کھوون، کانپن، برسن

گانے، لینے، دیکھنے، رونے، کھونے، کانپنے، برسنے

اس طرح کی افعال اور بھی شکلیں ہیں، مگر ان کو طوالت کے خیال سے نظر انداز کیا جاتا ہے،

(۱۰) جمع دو طرح کی ملتی ہے

(ا) لفظ کے آخر میں نؔ لگا کر جمع بنائی گئی ہے، مثلاً

لوگ سے لوگن، نبی سے نبین، ولی سے ولین، تارا سے تارن،

(ب) کہیں نؔ کے بجائے الف نون ہے، جیسے بات سے باتان، یا بتیاں

(۱۰) فاعل اور مفعول کی علامات اکثر موقعوں پر حذف کر دی گئی ہیں،

اب ہم مرثیہ کے مطالب پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں، پہلا بند حضرت مسیح (شاہ عیسی) کی منقبت سے شروع ہوتا ہے،

عیسن شاہ مہا گر گیانے   جا[1] کے کت کنوں نہیں جانے
نبین میں جو نبی ہمارے   ولین میں یوں عیسن پیارے
جگ نس مانہی عیسن پیارا   چودس چاند بھیو اجیارا
ات سندر محبوب الہی   جن ساکوں دیبی ساہی
سندر سکھی سبحان پیارے   پربت ہوں نیں ہیں ات بھارے

پیر و مرشد حضرت شاہ لشکر عارف کے عرس کی تیاریاں

عرس سنو شہ لشکر گیرو   عید کیے تھے لوگ گھنیرو
ات اچرج دو ٹھور بنائے   جا کے برن نہ برنے جائے
نیکے بستر آن بچھائے   بھیتوں پر مخمل بھرائے
ات بن کے شمیانے آئے   دل بادل اور تنبو تانے
ٹھور ٹھور پر دیپک بارے   انبر پر جوں سوہیں تارے

عرس کی خبر ہر جگہ پھیل گئی اور عقیدت مند جوق در جوق آنے لگے، ان میں صاحب دنیا بھی تھے اور تارکِ دنیا بھی، حضرت موصوف کے دونوں صاحب زادوں فتح محمد اور عبد الستار نے لوگوں کا استقبال کیا، اور ان کو حسب مراتب بٹھلایا،

مہا سبھا کے ٹھاکر آئے   جیسے جے تے تہان بٹھائے

---

[1] خط زدہ الفاظ اوپر کی مثالوں میں دیے جا چکے ہیں،

لوگوں کے جمع ہو جانے کے بعد "چودھویں کے چاند" کے مانند حضرت عیسیٰ گھر سے نکلے،

گھر تیں نکسے عیسن پیارے   جیسے چودس چاند اجارے

حاضرین کی عطریات سے تواضع کی گئی، موسیقی کے استادوں نے اپنے فن کا کمال دکھلایا، ادھر محفلِ عرس گرم تھی، اُدھر (آسمان پر) حضرت عیسیٰ کے لیے جنت سجائی جا رہی تھی،

حکم کیا ہر سرگ بناؤ   بر نپر اک ٹھور ملاؤ
احمدن کارن تخت بنایا   ات ہیرے اور لال لگایا
تاہر اچرج سیج بنائے   جا کے برن نہ برنے جائے
شور بھیو سو احمد آیو   جن کارن دو جگ اپایو
سب ارواح ملے اک ٹھاہی   بر نپر سب اگون دوری

حضرت محمد غوث اور شاہ لشکر محمد عارف کی روحیں حضرت عیسیٰ جند اللہ سے ملنے کے لیے خانقاہ میں آئیں، آپ الگ الگ دونوں سے بغل گیر ہوئے،

جب گر دیکھے عیسن پیارے   سب لوگن تیں بھئے نیارے
اٹھ کو گر کر لیوں دہائے   محمد غوث لے گریں لگائے

اور شاہ عیسیٰ کو اطلاع دی گئی کہ انھیں عالم بالا میں بلایا گیا ہے،

نبی محمد توہ بلا دیں   تجھ کارن سب سرگ بناویں

یہ اطلاع حضرت نے اپنے ایک خاص مرید فرید سے اس طرح بیان کی

سنو فرید مرید ہمارے   تم ہو میرے جیو کے پیارے
ہمے تو ہر کا آنا آیا   نبی محمد ہمیں بلایا
محمد غوث ہم لیون آئے   شہ لشکر سنگ ہمیں لائے

پیر ہمارے ہمیں بلا دیں   ہم کارن سکھپال بنا دیں

اب دن بھئے ہمارے تھوڑے   جیہ تین پران ہمارے چھوڑے

اوپر کے بند میں جمع متکلم کی مفعولی حالتوں پر غور کیجئے، ہمیں، ہتے بھی ہے، اور بغیر علامتِ مفعول (کو) کے ہم بھی۔ اور چوتھے شعر کے مصرعۂ ثانی میں ہم ہمارے کے مفہوم کو ادا کر رہا ہے،

حضرت شاہ عیسیٰ محفل سے اٹھ کر چلے گئے، اور جب آسمان پر ستاروں کی محفل منتشر ہوئی، تو حضرت کی روح عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔

جب نکسو بہا تو تارا   چھپ گیو چودس چاند ہمارا

چھپ گیو چاند گھٹا آئی کاری   چودس رین بھئی اندھیاری

چھپ گیو دیپک بھیو اندھیرا   چرن کو نہیں سوجھت ہیرا

کوں گیو ہیں عیسن پیارے   کو کے سنگ ہوے سرگ سدھارے

آپ کی رحلت سے خانقاہ میں صفِ ماتم بچھ گئی، تجہیز و تکفین کی تیاریاں ہونے لگیں، "کوثر و زمزم" سے غسل دیا گیا اور "تن سکھ بھیروں" کا کفن پہنایا گیا،

جنازہ اٹھنے کا منظر ملاحظہ ہو!

سب میتوں مل کھاٹ اٹھائے   دیکھو لوگو ہر کو آئے

دھرتی سگری کانپن لاگی   انبر ہوے بھری براگی

گھن گرجے اور بادر رووے   ہنس کہ کیوں سکھ کے سووے

سس سورج اور روویں تارے   ہنس کہ دھون کوں بچارے

دن گر سو دت بھیو اندھیرا   کچھ نا لبا اک میرا تیرا

جب خانقاہ میں آخری دیدار کے لیے جنازہ رکھا گیا تو "الم نصیب" پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے،

سب برہی برہ کے مارے   ٹوٹ پڑے جوں انبر تارے

چرن جبار چلے گورگیانے   ان بن لو ہو رو رو ہانے

زمین کے نصیب جاگ گئے، گورکنوں نے قبر کھود دی، اسے گل و عنبر سے بسایا گیا، "تدفین" کے بعد شاعر "کل نفس ذائقۃ الموت" کے مفہوم سے غمزدوں کو تسکین دیتا ہے،

مت یوں جانو شاہ سمانے   جاوک سدہ اور کھرے سیانے

پیر پیمبر جو ات آئے   سب اس دھرتی مانہ سمائے

سب مرہیں کسو نہیں جینا   یہ پیالہ سب کو ہو پینا

سپنے میں کچھو جو کوئی پائے   جاگ پڑے تب ہاتھ نہ آئے

یہ جگ سارا سپنا جانو   یا میں سو ستے (ہی) پچھانو

وفات کے بعد عبد الرحیم خانخانان نے "صرف خاص" سے ایک روضہ بنوایا، اور عوام و خواص اس در سے مستفیض ہونے لگے،

اوپر روضہ پاک بنایو   جاکون دیکھت جگ برمایو

جو من تیں منا کر آویں   یا در تیں محروم نجاویں

اوپر کے اشعار میں جاکون (جس کو)۔ مَن تیں (منتیں) یا (اس)۔ تیں (سے) کا استعمال توجہ طلب ہے۔

آپ کی وفات سے خاندیس، دکھن، ہند، سندھ، بلخ، بخارا، روم، شام، کشمیر، آگرہ، دلی، ملتان، کابل، قندھار، شیخوپورہ، پٹن، لاہور، اور اندر کوٹ وغیرہ ساری دنیا میں ماتم بپا ہو گیا، بعض نے اس خبر پر یقین نہیں کیا، اور بعض حیران رہ گئے، شاعر پھر تسلی آمیز انداز اختیار کرتا ہے،

محمدؐ سے محبوب سدھائے غوث قطبن سنگھن بھئے سائے

جو آیا ات نہ ات جائے جو ایجیا سو بھیا بنائے

پیر پیمبر جو ات آئے سب اس دھرتی مانہہ سمائے

اس کے بعد شاعر اس دیس کا بیان کرتا ہے جہاں جاکر کوئی نہیں لوٹا،

شاہنشاہ چلے تن دیسا چت سہو ہی جائے سندیسا

نان ات کے کوئی آئے بکھانے کیوں کر جا ہر سون لپٹانے

ادت کو گیونہ ات کو آئے جو اُت کی کچھو خبر سنائے

ادت اِت (ادھر اُدھر) کی باتوں میں شاعر بڑے پتہ کی بات کہہ گیا ہے، عالم ارواح کی کسے خبر ہے؛ مگر شاعر کا تخیل اس عالم کی یوں تصویر کھینچتا ہے،

یہ جگ جار چلے جب آگے نور تجلی برسن لاگے

سرگ لوگ اٹھ دوڑے پرت بادر ان کے اک ٹھوڑے

نبی ولی سب اگون آئے آدم لے کر گرے لگائے

نوح نبی کے ات من مانے موسیٰ دوڑ گلے لپٹانے

یعقوب نبی دیکھت بر مائے نو دو جے یوسف آئے

اب شاعر کا تخیل اس "خاص محل"[1] میں داخل ہوتا ہے، جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، اس کے بعد اس سے بھی آگے بڑھتا ہے، اور جلوۂ حق جل جلالہ کے دیدار سے حضرت کے مشرف ہونے کے ذکر کے بعد لکھتا ہے،

---

[1] شعر خاص محل جب گر جا بیٹھے آگیں نبی محمدؐ بیٹھے

(خاص محل میں حضرت رسول مقبولؐ کے سامنے جاکر بیٹھے)

مورکھ لوگ مو اگر لوجھے ان اولیا، اللہ بسوجھے

لا یموت رسول بکھانا جن من سانچ سانچ کے انا

کہت گئے ہیں سب سیانے امر بھئے تے مرہی جانے

جن ہر پریم پیالا پیا تے مرہیں کیوں مورک جیا

یعنی نادان کہتے ہیں کہ مرشد کا انتقال ہو گیا ہے، یہ نہیں جانتے کہ جو "مے عشق نبی" سے سرشار ہیں، وہ مرتے نہیں،

آخری بند میں شاعر کہتا ہے کہ یہ مرثیہ نہیں، معراج (نامہ) ہے،

مورکھ لوگ کہٹن بھیو ہیا

معراج نکہیں، کہیں مرثیا

ان اشعار کا غور سے مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مرثیہ میں بعض اشعار ایسے بھی ہیں، جن میں بڑی صداقتیں پنہاں ہیں،

اس مرثیہ کی سادہ اور سلیس زبان اس دور میں اردو کی مقبولیت کی شاہد ہے، اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عوام میں اردو کی مقبولیت کا راز اسی سادگی میں پوشیدہ ہے،

معدن المعانی

از عطاء الرحمن صاحب عطا کاکوی پروفیسر پٹنہ یونیورسٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ

معدن المعانی حضرت مخدوم الملک بہاریؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مرتب انکے مسترشد زید ابن عربی ہیں، جنھوں نے ان کے قریب رہ کر حضرت کے "فرمودات" کو قلمبند کیا ہے، اس مجموعہ کی حیثیت دوسرے ملفوظات مثلاً فوائد الفواد، راحت القلوب، فوائد السالکین وغیرہ کی جیسی نہیں، بلکہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے، چنانچہ مرتب نے لکھا ہے کہ اس کو حضرت مخدوم نے بتمامہ پڑھ کر اصلاح سے آراستہ کر کے تشنہ اور نامکمل مضمون کو مکمل کیا ہے، مرتب کے الفاظ یہ ہیں

"شیخ بزرگ وار سبقاً بعد سبق وکلمۃً بعد کلمۃٍ وحرفاً بعد حرفٍ قرأت کرد وچند جاکہ بیچارہ (مرتب) راسہوے رفتہ بود بلطف اصلاح فرمود، وحکایتے ومقالے مناسب تقریر وبیتے ورباعی مناسب تحریر می فرمود۔"

یہ عام ملفوظات کی طرح تاریخ وار نہیں ہے، بلکہ ایک مرتب کتاب ہے، جو مضامین کے اعتبار سے ۶۳ بابوں پر مشتمل ہے، اس سے اس کی اہمیت اور افادیت اور بڑھ گئی ہے، حضرت مخدوم نے سوالات کے جوابات نہایت مدلل، واضح اور تشفی بخش دیے ہیں، بعض اہم مسائل مثلاً ذکر اثبات وجود باری تعالیٰ، معرفت ذات وصفات، علم شریعت وطریقت، ذکر ثبوت جبر وقدر پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے، یہ کتاب اس لیے اور دلچسپ ہوگئی ہے کہ جابجا مثنوی، رباعی

اور فرد اشعار سے مزین ہے، اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت مخدوم کو شعر وشاعری سے اچھا خاصا لگاؤ تھا اور برمحل اشعار یاد تھے، یہ بھی قیاس ہوتا ہے کہ ممکن ہے حضرت مخدوم خود بھی شعر کہتے ہوں، اس لیے کہ اس دور میں شعر وشاعری کا خاصہ چرچا تھا، آپ کے خالہ زاد بھائی حضرت مخدوم احمد چرم پوش صاحب دیوان شاعر تھے، آپکے خلیفہ حضرت مظفر بلخی اور ان کے خلیفہ حضرت نوشہ توحید بھی شاعر تھے، لیکن ابھی تک اس کی تحقیق نہیں ہو سکی ہے کہ حضرت مخدوم کا منظوم کلام بھی ہے یا نہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی نثری تصانیف کے مقابلہ میں نظم کی اتنی اہمیت نہ رہی ہو، حضرت مخدوم کی متعدد تصانیف مشہور ومقبول ہیں، مثلاً مکتوبات کا دفتر سہ صدی و دو صدی، معدن المعانی، مخ المعانی، شرح آداب المریدین وغیرہ معدن المعانی کے قلمی نسخوں کی طرف ابھی میں نے رجوع نہیں کیا ہے، اس وقت ایک مطبوعہ نسخہ پیش نظر ہے، جو دو حصوں میں ۵۰۰ صفحات کو محیط ہے، کتاب کے آخر میں یہ عبارت ہے،

"الحمد للہ ..... کہ معدن المعانی من کلام .... حضرت مخدوم شیخ شرف الحق والملۃ والدین احمد یحیی منیری بسعی مولوی عبد القادر فردوسی بتاریخ بست ودوم شہر جمادی الآخری ۱۳۰۳ھ در مطبع شرف پریس بہار محلہ خانقاہ باہتمام شیخ نعمت علی طبع شد۔"

اس کتاب کو طبع ہوئے کچھ اوپر ۸۰ سال ہو چکے ہیں، اور تصنیف کا زمانہ تقریباً ۶۰۰ سال پہلے کا ہے، حضرت مخدوم کی وفات ۷۸۲ھ میں ہوئی ہے، مادہ تاریخ "پر شرف" ہے، یہ کتاب افادیت کے لحاظ سے بہت اہم اور بیش قیمت ہے، شہنشاہ اکبر اس کو پڑھوا کر سنتا تھا، ابو الفضل کے پاس بھی اس کا نسخہ برابر رہا، وہ اس سے فائدہ اٹھاتا تھا، اس کتاب میں کثرت سے اساتذہ اور اکابر صوفیہ کے اشعار ہیں، مولانا روم، سعدی، خاقانی، عطار کے اشعار

بکثرت ہیں، اور بہ قول مرتب : یہ ابن عربی پر بحث کے سلسلہ میں یہ اشعار زبان مبارک سے جاری ہوئے، باب بست و پنجم، ص ۲۲۲ میں " در ذکر بریدن از خلق" کی بحث میں یہ فقرہ ملتا ہے کہ حضرت مخدوم)

ایں مثنویات برخواند

عشق را با کفر و با ایماں چہ کار	عاشقاں را لحظۂ با جاں چہ کار
ہر کرا در عشق محکم شد قدم	در گذشت از کفر و از اسلام ہم
منکرے گوید کہ ایں بس منکر است	عشقِ او از کفر و ایماں برتر است

ان اشعار کے بعد عرفی کا یہ شعر بھی ملتا ہے،

عاشق ہم از اسلام خرابست وہم از کفر	پروانہ چراغِ حرم و دیر نہ داند

عرفی کا وجود تو حضرت کے دو سو سال بعد ظہور میں آیا، اس لیے اس کتاب میں اس کے اشعار کا پایا جانا حیرت انگیز ہے، غالباً پبلشر نے مضمون کے لحاظ سے ایک شعر اپنی طرف سے بڑھا دیا، اور اسکا احساس نہ ہوا کہ اس سے کتاب ہی مشتبہ ہو جاتی ہے، خدا جانے اور کہاں کہاں اس قسم کے تصرفات ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ حضرت مخدوم کی کل تصانیف کا ایک مکمل، مصحح اور دیدہ زیب اڈیشن شائع کیا جائے، اور جس طرح نکلسن نے اپنی زندگی مولانا روم پر وقف کر دی تھی، اسی طرح کوئی صاحبِ علم اپنی زندگی کو حضرت مخدوم کی تصنیفات پر وقف کر دیں۔

آثارِ علمیہ

مکاتیب مولانا سید سلیمان ندوی بنام شاہ معین الدین احمد

دار المصنفین کے قیام کے زمانہ میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کا برابر ساتھ رہتا تھا، اس لیے سفر کے علاوہ ان سے خط و کتابت کی نوبت نہ آتی تھی، البتہ ان کے قیام بھوپال کے زمانہ سے لیکر وفات تک خط و کتابت کا سلسلہ برابر قائم رہا، اور اس زمانہ کے ان کے بہت سے خطوط محفوظ ہیں، ان کی ترتیب و اشاعت کی نوبت معلوم نہیں کب تک آئے، اسلیے شائقین کی خواہش پر مناسب معلوم ہوا کہ معارف میں ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر دیا جائے، اس نمبر میں پہلی قسط شائع کی جاتی ہے، "م"

(۱)

۲۱ جنوری ۱۹۵۰ء

عزیز محترم جناب شاہ صاحب ادام اللہ سعدکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ آپ کا خط ملا، مبارکباد کا شکریہ، الحمد للہ تعالیٰ خیریت ہے، مزاج اعتدال پر آرہا ہے، امید ہے کہ چند روز میں اصلی حالت پر آجائے، یہ اتفاقی علالت نہیں ہے، بلکہ کوئی اصولی خرابی نظام جسم میں آگئی ہے، ایک دفعہ بعد رمضان المبارک بھوپال میں، دو دفعہ حرمین میں اور ایک آخری دفعہ جہاز میں یہ علالت پیش آئی، زکام و نزلہ کی ریزش

حلق پر ہوتی ہے، پھر سینہ پر ہوتی ہے اور سخت کھانسی آتی ہے اور بخار ہو جاتا ہے اور ضعف پیدا ہو جاتا ہے، اب اس دفعہ بمبئی کے ایک ماہر ڈاکٹر کا نسخہ استعمال میں ہے، آٹھ ہفتوں کے پینے کی دوا ہے، چار ہفتے گذر گئے، چار باقی ہیں، اللہ تعالیٰ شفائے کلی دیں،

آپ کے خط سے آپ کا شوقِ ملاقات ظاہر ہوا، یہ آپ کی سعادتمندی ہے، مگر چونکہ میرا ارادہ خود آنے کا ہے، اس لیے آپ اپنا ارادہ ملتوی کر دیں،

آپ کا نوٹ اخبارات کی افواہ کے متعلق پڑھا، اڈیٹر صاحب قومی آواز نے پہلے استعفا کا تار اور اب بعد جواب معذرت کا خط بھیجا ہے،

سنا ہے کہ آپ لوگوں کی طلبی مدرسۂ عالیہ کلکتہ سے آئی تھی، کیا یہ صحیح ہے، ابھی تو یہ آغاز ہے،

ع   اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

(۲)

برادرم   سلمکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ کے خطوط ملے، جواب میں تاخیر ہوئی کہ قلب مضطرب متعدد ہمہ گیر فیصلوں میں مصروف تھا جن میں سے بحمد اللہ ایک فیصلہ کر لیا گیا یعنی یہ کہ بھوپال سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا، اور ۲۰ر فروری کو ۲ ماہ کی بلا تنخواہ رخصت کا کاغذ حکومت میں بھیجدیا، یہ تمہید ہے استعفے کی، یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا کہ یہاں لوگ میرے قیام کیلئے بیحد مصر ہیں، اور حق یہ ہے کہ بھوپال نے اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ تک میرے استحقاق سے زیادہ میری قدر دانی کی،

اب میری ذاتی خانگی الجھنیں ہیں، ایک کا تقاضا یہ ہے کہ ہم لوگ بالفعل سید حسن صاحب کے پاس رہیں، اور دوسرے کا تقاضا یہ ہے کہ عاصم میاں کے پاس جائیں، دونوں مدد کے محتاج ہیں، مگر دوسری جگہ جانا آسان نہیں، اور ان کا آنا ہی آسان ہے، اس لیے دل پریشان ہے

دار المصنفین کے متعلق اگرچہ مولوی مسعود علی صاحب حسن ظن رکھتے ہیں لیکن مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ عنقریب حیدر آباد و بھوپال کی امدادیں بند ہو جائیں گی اور تجارت پر جو بندشیں ہیں، ان سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دار المصنفین کے ماہانہ مصارف میں غیر معمولی اضافہ چل نہیں سکتا، خدا کرے میرے یہ اوہام غلط ہوں، اسی لیے میں بار بار آپ کے ہاں سے خریداروں کی تعداد اور میزان منگواتا ہوں،

آپ نے اپنے کلکتہ نہ جانے کا جو عزم ظاہر کیا، اس سے دل بہت خوش ہوا، حقیقت یہ ہے کہ اس عمر میں جب قویٰ مضمحل ہو رہے ہوں خلف رشید کی طلب بہت بڑھ جاتی ہے اور اور اب وہ کیفیت سمجھ میں آتی ہے جو مولانا شبلی مرحوم اور مولانا حمید الدین مرحوم کی دیکھی تھی، کہ بعد کے کام کے لیے صحیح جانشین کا تصور ان پر بہت غالب تھا، اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کے اس ایثار کو قبول فرمائے، اور آپ کی قناعت میں بیش از بیش برکت عنایت فرمائے، اگر کہیں اور بھی میں چلا گیا تو بھی آپ ہی کی مدد پیش نظر رہے گی،

آجکل مولوی سعید انصاری صاحب خط و کتابت کر رہے ہیں، دار المصنفین میں بھی رہنے کو تیار ہیں، مگر دار المصنفین بھی لینے کو تیار ہے یا نہیں، یہ الگ بات ہے، حروف مقطعات پر کسی عراقی نے ایک لغو سی کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ پاکستانی نوائے وقت میں چھپا تھا، اسکا جواب لکھ کر چھپوایا ہے، جواب اچھا ہے، اس میں ابتداءً مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین رحمہما اللہ تعالیٰ کا اور آخرؔ سید سلیمان اور مولوی عبد السلام صاحب کا ذکر ہے، اور اپنے نام کے ساتھ سابق رفیقِ دار المصنفین لکھا ہے،

میں نے ۱۰ تاریخ سے رخصت طلب کی ہے، امید نہیں کہ ۱۰ تک رخصت کی کارروائی تکمیل پا سکے، اب اس کا انتظار کرنا ہوگا، ریاست بحیثیت ریاست اب باقی نہیں ہے، بلکہ یہ

انڈین یونین کا ایک چھوٹا سا صوبہ ہے چیف کمشنر یہاں کا مالک ہے، وہ جو چاہے حکم دے اور جو چاہے کرے، ایک ڈکٹیٹر کی شان سے اس کی حکومت ہے، میں نہیں جانتا کہ ہندوستان کے اور صوبوں کا کیا حال ہے، مگر ع قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا،

یہاں کتابیں کچھ جمع ہوگئی تھیں، کچھ خطوط و کاغذات تھے، کل ان کو پیک کرا دیا ہے، انکو دار المصنفین بھیجنا چاہتا ہوں، باقی کپڑے، بستر، برتن وغیرہ ہیں، انکو ساتھ ہی لانا ہوگا،

دو چار روز سے صحت اچھی نہیں، معدہ ٹھیک نہیں، دست آجاتے ہیں، کل بھی یہی ہوا تھا، آج بھی یہی ہے، حالانکہ کھانا صرف دو وقت کر دیا ہے، صبح اور شام، پھر بھی رات کا کھانا ہضم نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں، آپ لوگ بھی دعا کریں،

ابو الجلال صاحب کی کتاب کی گم شدگی کا جو واقعہ پیش آیا وہ نیا نہیں، وہ تو انکی قسمت کا نوشتہ ہے کہ ان کا نوشتہ باقی نہ رہے، یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت و عندہٗ ام الکتاب، ہاں آپنے مولوی شبیر احمد صاحب یا کسی اور کی وفات پر غفر لہ اللہ لکھا ہے، یہ غلطی آپ سے کیسے ہوئی، غفر کا صلہ لہ ہے، غفر لہ اللہ چاہئے،

یحیٰی صاحب سے کہدیجئے کہ دار المصنفین کا کاغذ فروری تک کے لیے دفتر حضور میں بھیجدیا ہے، روپیہ مارچ میں ملیگا، تقاضا کروں گا، مولوی مسعود علی صاحب اگر ہوں تو یہ خط انھیں بھی دکھا دیجئے گا، ان کو اور رفقا کو سلام کہدیجئے، والسلام

سید سلیمان ، ۵ مارچ ۱۹۵۰ء

(۳)

کراچی

عزیز من ادامکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ، خط ملا، دل میں ایک دنیا خیالات کی ہے، مگر افسوس ہے کہ دل

ایسا بیٹھا ہوا ہے کہ زبردستی چند سطروں کی تحریر پر دل آمادہ ہوا ہے، یہ چار ماہ یوں ہی پڑے پڑے گذر گئے، واپسی کا ارادہ کئی دفعہ ہوا، مگر صرف اولاد کے مستقبل کا خیال اور بعض قومی و مذہبی آرزوؤں کی تکمیل جلد واپسی سے روک لیتی ہے، میں نے ابھی تک کوئی سرکاری زنجیر اپنے پاؤں میں نہیں ڈالی ہے، بحمد اللہ کہ صبح کی نماز کے بعد ایک گھنٹہ ایک مسجد میں درس قرآن ہوتا ہے، سو سوا سو سامعین ہوتے ہیں، جن میں بعض افسران تک بھی ہوتے ہیں، یہی حاصل زندگی ہے، کراچی میں ابتک تین قسم کے لوگ آئے ہیں، یا فقراء پناہ گیر، یا متلاشی روزگار نو تعلیم یافتہ یا سرمایہ دار تجار، مگر خالص اہل علم اور علماء بہت کم آئے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مستقبل میں اگر اسکی تلافی نہ ہوئی تو لادینی فضا پیدا ہونا لابد ہے، بحمد اللہ کہ دین کی طلب سب میں موجود ہے، متعدد مرکزی مساجد میں درس قرآن اور سلسلۂ مواعظ ہے، عربی کی ایک بڑی درسگاہ اشرف آباد بہ نسبت حضرت مولانا اشرف علی صاحب ٹنڈو الہ یار ضلع حیدر آباد سندھ میں دار العلوم الاسلامیہ کے نام سے قائم کی گئی ہے، دیوبند اور مظاہر العلوم کے علماء افاضل مدرس ہیں، ابھی طلبہ کی تعداد پچاس ہے،

یہاں مسلمان اپنا سارا اثاثۂ دماغی و ذہنی ہندوستان میں چھوڑ کر آئے ہیں، کتب خانے مدرسے اور ادارے ہندوستان میں ہیں، ضرورت ہے کہ یہاں بھی دیوبند، ندوہ، دار المصنفین مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ قائم ہو، ابھی سب افکار اور خاکے ہیں، امکانات بے انتہا ہیں، مگر مشکلات بھی ہیں،

آپ حضرات اپنی جگہ جمے رہئے اور اب دار المصنفین کو بجائے ایک کے دو کی یادگار سمجھیے نیا نظام قائم کیجئے، حالات اگر وہاں ناساز گار ہوں گے تو پھر موقع ہے،

میری منبر کے خانہ میں مولانا شروانی اور بہت سے اکابر کے خطوط ہیں، ان کو جمع اور محفوظ کیجئے،

شروانی صاحب کے خطوط کو نکلوا کر یکجا کر کے اگر مرتب کیا جاسکتا تو معلومات اور انشا پردازی کا اچھا خاصہ مجموعہ ہوتا،

آپ سے ایک فرمایش کو جی چاہتا ہے، جس طرح میں نے اور مولوی عبدالسلام صاحب نے حضرۃ الاستاذ کی ایک ایک تحریر کو زندہ کیا، آپ صاحبان میرے مضامین و مقالات کو بہ ترتیب جمع کرتے کہ اب میری زندگی ان ہی اوراق سے عبارت ہے، ۲ر صفر کو میری عمر قمری حساب سے انہتر (۶۹) سال کی ہو گئی، رہے نام اللہ کا،

الگ خط مولوی مسعود صاحب کو لکھوں گا، مضمون کی رسید لکھئے، اب تک عاصم میاں کا پتہ نہیں،

ہاں معارف میں منکرین حدیث کی رد میں جس قدر مضامین آپ کے اور میرے نکلے ہیں ان کو جمع کریں، اسی طرح تاریخ حدیث اور تاریخ صحاح پر معارف و الندوہ میں جو کچھ نکلا ہے، اس کو ایک کتاب میں جمع کیجئے، عبدالباری صاحب اگر میرے مضامین معارف کی ایک فہرست بنادیں تو بڑی مہربانی،

والسلام

سید سلیمان، ۱۴ر نومبر ۱۹۵۰ء

(۴)

برادرم وفقکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ خطوط ملے۔ الحمد للہ تعالیٰ خیریت ہے، دو تین روز ہوئے کہ عاصم میاں مع سامان و عیال بخیریت پہنچے، ان کا یہ سفر کافی طویل اور پیچیدہ تھا، مگر بحمد اللہ تعالیٰ کہ اس ہفتخواں کو وہ بخیریت طے کر آئے۔

دارالمصنفین کی ہستی کو صرف میری ذات سے متعلق نہ سمجھیں، ہر انسان فانی ہے، اس لیے اس کی نسبت فانی ہے، انشاء اللہ تعالیٰ آپ عزیزوں کی محنت سے اس کو بقا نصیب ہو،

آپ کی انشا، ماشاء اللہ بہت ترقی کر رہی ہے، خصوصیت کے ساتھ شروانی صاحب کی وفات پر جو شذرات آپ نے لکھے ہیں، بہت بلند و پرزور ہیں، اللہ تعالیٰ مزید زور و بلندی عنایت فرمائیں،

شروانی نمبر کی مجوزہ ترتیب مناسب ہے،

آپ کے اس یقین دلانے سے کہ آپ دارالمصنفین کی خدمت اسی طرح کرتے رہیں گے بڑی خوشی ہوئی، یہی امید عزیزی صباح الدین سلمہ سے ہے، اگر حالات کا نقشہ کچھ پلٹے تو اس کے مطابق عزائم میں تبدیلی ہو سکتی ہے،

دارالمصنفین کی نئی تنظیم کی ضرورت ہے، اور اس کے بغیر اس کی زندگی محال ہے، دارالمصنفین ایک رجسٹرڈ باڈی ہے، اس کی تشکیل قانونی ضروری ہے، ضرورت ہے کہ نئے صدر کا انتخاب کیا جائے اور نظامت میں مناسب تبدیلی ہو،

آپ نے میرے کاموں کی تکمیل کا جو ارادہ ظاہر کیا ہے اس سے بڑی تسکین ہوئی، یہاں متعدد ادارے میری اعانت و تعاون کے طالب ہیں، دیکھیے کیا ہو،

میں تو یہاں جیسا آپ جانتے ہیں، چند کپڑے لیکر عارضی پرمٹ پر آیا تھا، مگر مدت اقامت بڑھتی گئی، باوجود دوستوں کے اس علانیہ مشورہ کے کہ میری اب ضرورت وہاں نہیں، وہاں سے قطع تعلق کا خیال نہ تھا، مگر حالات بدلتے گئے اور نئی صورتیں پیش آئیں، یہ ساتواں مہینہ گذر رہا ہے کہ کوئی ذریعۂ آمدنی اختیار نہیں کیا،

یہاں ایک بڑا دارالعلوم ہے، تصنیفی و تبلیغی شعبوں کا قیام ہو چکا ہے، اور اس کے لیے میری صدارت کی تحریک ہے، یہ ادارہ حیدرآباد سندھ کے ضلع میں ٹنڈو (یعنی قصبہ) اللہیار میں قائم ہو رہا ہے، اس کو سرکار سے کوئی تعلق نہیں ہے، شرفا کا اچھا خاصہ قصبہ ہے، ۵۴ ایکڑ زمین اس کے لیے وقف کی گئی ہے، ابھی چند عارضی کمرے بن گئے ہیں، متعدد اکابر اساتذہ اس سے اب تک متعلق ہو چکے ہیں،

مولوی عبد السلام صاحب کی امام رازی کا اشتہار تو دیکھا مگر اب تک دیدار سے محروم ہوں موصوف کو سلام کہدیجئے،

میری میز پر دفتی میں سیرۃ نبوی حصۂ ہفتم کے صاف شدہ مسودہ کے اوراق ہیں، مہربانی کر کے مطلع کیجئے کہ میری یاد صحیح ہے یا نہیں، تقریباً سوا سو صفحے ہوں گے، ذرا اطمینان ہو تو اس کی تکمیل کی جائے، اسی طرح میز پر سادہ کاغذوں کی ایک بڑی مجلد کاپی ہے، جس کے شروع میں قرآن پاک کی آیتوں کے حوالے احکام القرآن کے سلسلہ میں ہیں، ڈھونڈھ کر مطلع کیجئے،

مولوی مسعود علی صاحب کی خدمت میں سلام کہدیجئے گا،

والسلام سید سلیمان ۶؍دسمبر ۱۹۵۰ء

(۵)

مورخہ ۲۴؍مارچ ۱۹۵۱ء

برادر عزیز توفیق الٰہی رفیق حیاتش باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کے کئی خط ملے جو آپ کے تعلق خاطر اور محبت قلبی کے شاہد عدل ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو دین وملت کے خدمات کی مزید توفیق عنایت فرمائیں، میں نے جواب میں خاموشی اختیار کی کہ میں نے اپنی کشتی منجدھار میں توکلاً علی اللہ چھوڑ دی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندۂ محتاج کے ساتھ جو معاملہ بھی فرمائیں گے وہ اس کی عین عنایت اور عین مصلحت وحکمت ہوگی، دار المصنفین میں آپ لوگوں نے جو طے کیا، میں اس پر راضی ہوں، اور درگاہ الٰہی میں داعی ہوں کہ اس کو دار المصنفین کے حق میں مفید ونافع فرمائے،

سپردم بتو مایۂ خویش را تو دانی حساب کم وبیش را

معارف میں آپ اپنے جدید نظام کا ذکر جس طرح چاہیں کریں، آپ کے ہونے کو میں اپنا ہی

ہونا سمجھتا ہوں، اور مجھے آپ کی قائم مقامی سے ویسی ہی خوشی اور طمانیت ہے جو کسی روحانی اور جسمانی خلف الصدق کی جانشینی سے ہو سکتی ہے، خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی موت کے بعد کے دار المصنفین کا نقشہ دیکھ لیا،

اب آپ جہانتک ہو سکے دین وملت کی خدمت سمجھکر اس کام کو انجام دیں، اور ساتھ ہی اپنے رفقائے کار کی تیاری میں مصروف رہیں، تاکہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ یوں ہی جلتا رہے، اور استاد مرحوم کا سلسلہ قائم رہے، معارف[1] میں آپکے شذرات پڑھے، بحمد اللہ آپ نے شذرات کے معیار کو قائم رکھا، "س" اور "م" میں شاید ہی سے کسی کو فرق محسوس ہو، ولِلّٰہ الحمد،

میں نے یہاں کے اپنے حالات ابھی تک کچھ نہیں لکھے، انشاء اللہ کچھ دنوں کے بعد لکھونگا، بالفعل تو معطلانہ اور متوکلانہ زندگی بسر ہو رہی ہے، گورمنٹ نے پنجاب یونیورسٹی کمیشن اور لاء کمیشن میں ممبر مقرر کیا ہے، اسی سلسلہ میں آج لاہور جا رہا ہوں، ۳۱؍ کو واپس آؤں گا، یہاں یکم کو تاریخ اسلام کانفرنس ہوگی، جس کی صدارت کے لیے مجھ سے خواہش کی گئی ہے،

آپ اپنے رفیق عزیزی صباح الدین سلمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ رفاقت کا پورا حق ادا کیجئے، اور ان کی دلدہی اور دلنوازی اور انکی ضروریات پر پوری رعایت کے ساتھ نظر رکھیں، اور ان کے ساتھ ایسا برتاؤ رکھیں کہ ان کو دار المصنفین سے وحشت نہ ہو،

یہ میں نے صرف اپنی طرف سے ناصحانہ پیش بینی کے طور پر لکھا ہے، ورنہ مجھے معلوم ہے کہ آپ اس میں سے ہر بات کا خود ہی اپنی شرافت اور رفاقت پسندی سے لحاظ رکھتے ہیں، اور اسکا خود انھیں بھی اقرار ہوگا،

والسلام

سید سلیمان

[1] معارف یعنی سلیمان اور معین الدین

(۶)

کراچی

عزیز مکرم رفع اللہ تعالیٰ احوالکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الحمد للہ مع الخیر ہوں، فروری کا پورا مہینہ احتفال علماء الاسلام کی مشغولیتوں میں گذر گیا، بحمد اللہ ۲۰ ملکوں کے مسلمان علماء نے جو عراق سے لیکر الجزائر تک سے آئے تھے، جن میں ایران ونجف کے علماء بھی تھے، بہت سے مفید کام انجام دئے، کام سے الگ میں تو علماء کے اس اجتماع کو تاریخ کا بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں، تجاویز جن میں مختلف اسلامی فرقوں کے درمیان ارتباط اور جائز رواداری کی بھی تجویز تھی، باتفاق آرا منظور ہوئیں، نجف کے مجتہد مشہور آل کاشف الغطاء اور مفتی اعظم فلسطین نے مل کر اسلامی فرقوں کے درمیان خوشگوار فضا کے پیدا کرنے میں بڑی مدد دی، جامع ازہر کا وفد بھی آنے والا تھا، مگر عین وقت پر شیخ ازہر کی تبدیلی سے وفد روانہ نہ ہو سکا،

آپ نے سنا ہوگا کہ مجمع فواد الاول مصر نے مجھے اپنا رکن منتخب کیا ہے، یہ مصر کی سب سے بڑی علمی عزت ہے، سفیر مصر جو ابھی واپس آئے ہیں، انھوں نے یہ اطلاع دی ہے، ابھی میرے پاس مصر سے سرکاری اطلاع نہیں آئی ہے،

بغداد میں عراق گورنمنٹ کی طرف سے ابن سینا کی ہزار سالہ یاد منائی جارہی ہے، عراق گورنمنٹ نے مجھے اس میں شرکت کی دعوت دی ہے، مارچ کے آخر میں ہے، اگر پاکستان گورنمنٹ کی طرف سے اخراجات کی منظوری ہوئی تو جانے کا قصد ہے، ہوائی جہاز سے ۵ گھنٹوں کی راہ ہے، پانی کے جہاز سے ایک ہفتہ لگ جاتا ہے،

فروری کے معارف کی لکھائی چھپائی ماشاء اللہ اچھی ہے کس نے لکھا ہے، قادر خاں کی شان

معلوم ہوتی ہے، آپ کا مقالہ اردو والا اچھا ہے، مگر وہاں سوال دلیلوں کا نہیں ہے، بلکہ فیصلہ کا ہے، دیکھیے علاقائی زبان مانے جانے کی تحریک کہاں تک کامیاب ہوتی ہے،

دیبل کے معلومات ملے، شکریہ، آپ نے سمعانی سے علماء دیبل کی نقل نہیں بھیجی، وہ بھی چاہئے، مارچ کا مہینہ بھی میرا بہت مصروف ہے، ۷ سے ۱۰ تک شاید لاہور میں مختلف علمی وتعلیمی اداروں میں شرکت ہوگی، اسی میں پنجاب یونیورسٹی میں قصص القرآن کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھوں گا انشاء اللہ تعالیٰ پھر بہاولپور کی جامعہ عباسیہ کے نصاب کا کام کرنا ہے، مولوی ناظم صاحب ندوی وہاں کے شیخ الجامعہ ہوگئے ہیں، چار سو تنخواہ ملی ہے، وسط ماہ میں ملتان میں ایک عربی مدرسہ کا جلسہ ہے، اس میں شرکت ہوگی،

معلوم نہیں اعظم گڈھ میں اسمبلی اور کونسل کے ممبر کون کون ہوئے، پڑھا تھا کہ وہاں شاستری اور فرید احمد انصاری کا مقابلہ ہے، اور مئو سے وہاں کے مولوی عبد اللطیف صاحب کو کانگرس نے چنا ہے، مولوی حبیب الرحمن صاحب کا خط آیا ہے، بڑی محبت والے آدمی ہیں،

مدینہ اخبار میں میرے متعلق جو گہرافشانی ہو رہی ہے، آپ کی نظر سے بھی گذری ہوگی، جس چیز سے میرا تعلق نہیں، اس میں مجھے شریک کرنا کہاں تک انصاف ہے،

آپ کے پاس مصر کا ایک طبلق بھیجتا ہوں، یہ بھی عجائبات ڈاک میں سے ہے، پتہ دار المصنفین اعظم گڈھ ہے، مگر مجھے یہ سیدھا کراچی میں ملتا ہے،

والسلام

سید سلیمان، یکم مارچ ۱۹۵۲ء

(۷)

کراچی ۵

برادر عزیز وفقکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ کا کارڈ مورخہ ۸ جون ملا، یہاں بھی چند روز شدید گرمی رہی،

ہوا میں لو کی کیفیت تھی، ۱۱۸ ڈگری پارہ تھا، بحمد اللہ کل دوپہر اور رات کو بارش ہوکر ٹھنڈک ہوگئی، یہاں بھی مقامی تخمی آم چل رہے ہیں، مگر وہ آپ کے ملک کی نفاست یہاں کہاں، گو بعض اضلاع سندھ میں کوشش ہو رہی ہے کہ ملیح آباد اور لکھنؤ کی قلمیں لگا کر کامیابی حاصل کی جائے، اس کے لیے ابھی چند سال درکار ہیں، مسلمان جہاں جائیگا اپنا تمدن پیدا کرے گا،

خطوط کی اشاعت میں اس کا خیال رہے کہ اس میں راز کی بات نہ ہو، خصوصاً زندہ لوگوں کے خطا نہ چھاپے جائیں، شروانی صاحب کے خطوط چھاپئے،

یہاں دونوں بچیوں کی نسبت کے پیغام چل رہے ہیں، گفتگوئیں جاری ہیں، جہیز کے سامان کیے جا رہے ہیں، اس لیے اگر جلد ہی انجام دینے کی کوشش کامیاب ہوئی تو پھر سفر مشکل ہے، آپ اپنا کوئی پروگرام معطل نہ کریں،

فہرست ابن ندیم پہنچ گئی، آجکل پروفیسر ہٹی امریکی تاریخ عرب کے مصنف یہاں آئے تھے، ایک پارٹی میں ملاقات ہوئی، کہنے لگے آپ کا نام میں نے پڑھا ہے، اب پھر ۲۸ کو آئینگے امریکی سفارت نمانے ان کے ڈنر میں بلایا ہے،

والسلام

سید سلیمان ۲۳ جون ۱۹۵۳ء

مکاتیب شبلی حصہ اول و دوم

مولانا مرحوم کے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ، جس میں مولانا کے قومی خیالات اور علمی، تعلیمی اور ادبی نکات ہیں، اور حقیقت میں مسلمانوں کی تیس برس کی تاریخ ہے،

قیمت: جلد اول ؎۳، دوم ؎۱۲

منیجر

مطبوعات جدیدہ

تجدید معاشیات، از جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۸۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۸ر، پتہ: مکتبہ تجدید دین شبستان قدم رسول، ہارڈنگ روڈ، لاہور،

پیٹ اور روٹی اور اس کا وسیلہ مال انسان کی بنیادی ضروریات میں ہے، مگر اسی حد تک جس حد تک بقاے حیات کے لیے ضروری ہے، اس سے زیادہ جہاں حرص بڑھی، اس کی کوئی حد نہیں رہ جاتی اور جائز و ناجائز حلال و حرام کی تمیز بالکل اٹھ جاتی ہے، اور انسان حرص و ہوا کا تسلط اور مال جو خیر ہے، ہر قسم کے مفاسد کا ذریعہ بن جاتا ہے، اس لیے تمام مذاہب اور مصلحین اخلاق نے اس کی حرص سے روکا ہے، مگر موجودہ تمدن کی بنیاد تمامتر مادی ہے، اور اس کا نصب العین ہی دنیاوی عیش و تنعم ہے، اس لیے اس میں سب سے زیادہ اہمیت معاشیات یعنی مال و دولت کو حاصل ہے حتی کہ سیاست بھی اس کے تابع ہوگئی ہے، اور آج دنیا کی قوموں میں جو کشمکش اور مسابقت برپا ہے، وہ صرف اسی لیے کہ ہر قوم اپنے لیے زیادہ سے زیادہ سامان تنعم فراہم کرنا چاہتی ہے، جس کے نتائج سب کی نگاہ کے سامنے ہیں، اس میں اسلام کا نقطۂ نظر نہایت حکیمانہ اور معتدل ہے، اس نے مال و دولت یا معاشیات کی واجبی اہمیت کو قائم رکھا ہے، مگر اس کے حصول کے ذرائع اور اس کے مصرف پر اتنی قیدیں لگادی ہیں، جن سے اس کی ساری خرابیاں دور ہو جاتی ہیں اور وہ شر کے بجائے خیر بنجاتا ہے، حضرت مولانا اشرف علی کی نگاہ بڑی ہمہ گیر تھی، انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں مال و دولت کے متعلق بھی جا بجا

خیالات ظاہر کیے ہیں اور انکی اصلی حیثیت واضح کی ہے، ان کے خلیفۂ ارشد مولانا عبد الباری صاحب نے جو انکی دینی تجدیدات کے مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں، اب انکی معاشیات کی تجدید پر یہ کتاب لکھی ہے، اس میں انسان کے مقصد حیات، مال و دولت کی حیثیت، اس کے کسب اور صرف کے متعلق حضرت مولانا کے خیالات کو اپنی تمہید و تشریح کے ساتھ اس بسط و شرح اور جزوی تفصیل کے ساتھ مرتب طریقہ سے پیش کیا ہے کہ اس کا کوئی پہلو چھوٹنے نہیں پایا ہے، اس کی جامعیت کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، فقہ کی کتابوں میں مالی و معاشی مسائل پر مستقل ابواب اور اس کے بعض پہلوؤں پر مستقل کتابیں موجود ہیں، تجدید معاشیات اس قسم کی فقہی کتاب نہیں ہے جس میں معاشیات کے مسائل اور اس کے نظام پر بحث کی گئی ہو، اس کا نقطۂ نظر زیادہ تر اخلاقی اور زاہدانہ ہے اور معاشیات کے فقہی مسائل کے بجائے انسان کے مقصد حیات اور مال و دولت کے متعلق اسلام کی اصلی اسپرٹ کو واضح کیا گیا ہے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نظر بڑی حکیمانہ تھی اور ایسے ایسے گوشوں پر پہنچتی تھی جدھر عام لوگوں کا ذہن مشکل سے منتقل ہو سکتا ہے، اس لیے اس کتاب میں دینی حیثیت کے علاوہ معاشیات کے متعلق خالص دنیاوی اور تجربی حیثیت سے بھی بڑی حکیمانہ باتیں ہیں، فاضل مؤلف کی تشریحات اور تعلیقات نے اس کو اور زیادہ مفید و موثر بنا دیا ہے، وہ جدید معاشیات سے بھی واقف ہیں، اس لیے جا بجا اس سے بھی بحث کی ہے، جو لوگ معاشیات کو خالص مادی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور اسی حیثیت سے اس کا حل چاہتے ہیں، ان کو تو شاید اس کتاب کے مباحث سے تشفی نہ ہو، لیکن جن کا ذوق دینی و اخلاقی ہے انکی تسکین و تسلی کے لیے یہ کتاب کافی اور ان کے معاشی امراض کے لیے شافی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر حرص و ہوس کو چھوڑ کر مال و دولت کے متعلق صحیح نقطۂ نظر پیدا ہو جائے تو بہت سے معاشی مشکلات کا خود بخود خاتمہ ہو جائے،

چند دن حجاز میں ۔ از جناب حاجی محمد زبیر صاحب لائبریرین اسسٹنٹ یونیورسٹی لائبریری

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۰۲ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت: ۱۲ر پتہ: فرحت منزل، بدر باغ، علی گڈھ،

یہ حاجی محمد زبیر صاحب کے سفر حج اور زیارت مدینہ طیبہ کا سفر نامہ ہے، اس میں سفر کی روداد، جذبات و تاثرات، حرمین کے مشاہد کے حالات، حج کے فضائل و فوائد، اس کی تاریخ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین، اور بعض اموی و عباسی خلفا کے حج کے حالات، حج کا طریقہ، اس کے مسائل اور دعائیں وغیرہ سفر حج کے متعلق اور مختلف قسم کے ایسے معلومات لکھے ہیں جنکی ایک حاجی کو ضرورت ہوتی ہے، اسلیے اسکا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب ہے،

مختارات ۔ مرتبہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحات، کاغذ اعلیٰ، خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے، قیمت تحریر نہیں، پتہ: دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ،

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے عرصہ ہوا عربی زبان و ادب کے اعلیٰ نمونوں کا ایک انتخاب کیا تھا، اس میں ابتدا سے لیکر اس وقت تک کے عربی طرز تحریر کے نمونے تھے، اس انتخاب میں اس کا بھی لحاظ رکھا تھا کہ عربی نثر کے اسالیب کے ساتھ اس کے مذہبی، تاریخی اور تہذیبی عناصر بھی سامنے آجائیں، عربی زبان میں فاضل مرتب کی مہارت و بصیرت مسلّم ہے، اسلیے یہ مجموعہ عربی ادب کا گویا عطر ہے، اس کا پہلا اڈیشن عرصہ ہوا لکھنؤ میں معمولی چھپا تھا، اب دوسرا اڈیشن مصر میں نہایت خوبصورت ٹائپ میں چھپا ہے، اس اڈیشن میں مولانا عبد الحفیظ صاحب بلیاوی استاذ ادب دار العلوم ندوۃ العلماء نے مشکل لغات اور اسماء و اعلام وغیرہ تشریح طلب امور کی ضروری شرح بھی کر دی ہے، جس سے پڑھنے والوں کے لیے بھی سہولت پیدا ہو گئی ہے، اور اس کتاب کا افادہ بھی بڑھ گیا ہے، یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ عربی مدارس کے نصاب میں شامل کیا جائے،

فہرست مطبوعات کتبخانہ ادارۂ ادبیات اردو، جلد اول } مرتبہ مولوی غلام رسول صاحب و مولوی محمد اکبر الدین صاحب صدیقی ایم اے

تقطیع بڑی، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی، قیمت ہے رپتہ: ادارۂ ادبیات اردو، خیرت آباد حیدرآباد دکن،

اردو زبان کے متعلق ادارۂ ادبیات اردو کی خدمات محتاج تعارف نہیں، اس کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے ایک قلیل مدت میں ایک وسیع کتب خانہ فراہم کرلیا ہے جس میں عربی، فارسی اور خاص طور سے اردو کی بارہ ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں، ان مطبوعات کے علاوہ اردو کے بہت سے نادر مخطوطات ہیں، مطبوعہ کتابوں میں بھی بہت سی اتنی قدیم ہیں کہ اب نادر و نایاب کی حیثیت رکھتی ہیں، اردو کے نادر مخطوطات کی فہرست کئی سال ہوئے شائع ہو چکی ہے، اب مطبوعہ کتابوں کی فہرست کی پہلی جلد مرتب کرکے شائع کی ہے، اس میں چار ہزار کتابوں اور ایک ہزار اخبارات و رسائل کی فہرست ہے، ان میں سے بہت سے اب نادر و نایاب ہیں، اردو پر کام کرنے والوں کے لیے یہ فہرست بڑی مفید اور کارآمد ہے،

وجدانِ حافظ۔ مترجمہ جناب منور لکھنوی تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۲ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ: کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، دہلی،

شیاما چرن داس صاحب سریواستو دہلی کی پرانی یادگاروں میں ہیں، انکو تصوف اور الٰہیات سے خاص ذوق ہے اور عملاً بھی انکی زندگی صوفیانہ اور درویشانہ ہے، اسلیے انکو خواجہ حافظ کے کلام سے بھی خاص دلچسپی ہے، چنانچہ انھوں نے اسکا ایک انتخاب عرفانِ حافظ کے نام سے مرتب کیا تھا، وجدانِ حافظ اسی کا منظوم ترجمہ ہے، کسی زبان کی نظم کا دوسری زبان کی نظم میں ترجمہ کرنا یوں بھی مشکل کام ہے، خصوصاً حافظ کے جیسے سراپا فصاحت و لطافت کلام کا ترجمہ اور بھی دشوار ہے، لیکن لائق مترجم کی مہارت معروف و مسلّم ہے، اسلیے انھوں نے ترجمہ میں ممکن حد تک اصل کی خوبی و لطافت کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کی ہے، اور بعض اشعار کے ترجمے تو ایسے برجستہ ہیں کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتے، کتاب کے ایک صفحہ میں اصل فارسی کا شعر ہے اور اسکے بالمقابل دوسرے صفحہ میں اسکا منظوم ترجمہ ہے، جن لوگوں کو حافظ کے کلام کا ذوق ہے ان کو اس شراب دو آتشہ سے لطف اندوز ہونا چاہیے، "م"

جلد ۷۹ ماہ شعبان المعظم ۱۳۷۶ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۵۷ء نمبر ۳

فہرست مضامین